ماہنامہ

قومی زبان

۱ر۲ر۸۰

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

ماہنامہ

قومی زبان

کراچی

اپریل ۱۹۸۰ء

★

جلد ——— ۵۰

شمارہ ——— ۴

قیمت فی پرچہ ——— ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ قیمت ——— پندرہ روپے

بیرون ملک ——— ستائیس روپے

★

انجمن ترقی اُردو پاکستان

بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

فون : ۲۱۷۱۳۷

فہرست

اداریہ		۳
سوچیۂ اقبال	فضل القدیر ندوی	۵
اقبال کا نظریۂ فن	محمد صدیقی امتیاز ایم اے	۹
ورق تازہ	ریاض صدیقی	۱۵
خطبہ صدارت انگریزی اردو جائزہ کانفرنس	عالی جناب جسٹس شمیم حسین قادری جج ہائی کورٹ لاہور۔	۱۹
انگریزی اردو کانفرنس کے مقاصد	ڈاکٹر سید عبداللہ	۲۱
قرار دادیں	نعیم صدیقی	۲۵
قومی زبان اردو کی موجودہ حیثیت اور اس کے مطالبات	حمید اللہ خاں ضیاء اسلام پوری	۳۱
خطبہ صدارت سائنٹیفک سوسائٹی پاکستان	ڈاکٹر بشیر الدین محمود (ناظم شعبہ صنعتی رابطہ جوہری توانائی کمیشن)	۳۵
ہینگی	مبارک علی	۴۵
انتخاب		۵۰
نئے خزانے	ابو سلمان شاہجہاں پوری	۵۳

ادارہ تحریر

جمیل الدین عالی

سید شبیر علی کاظمی

اداریہ

قومی زبان" اردو" کی ادبی تقویم کی رو سے جنوبی ایشیا بالخصوص پاکستان میں چودھویں صدی ہجری کی آفق پر ہمیں مفکر پاکستان شاعر مشرق علامہ شیخ محمد اقبالؒ کے آثارِ بزرگی ثبت نظر آتے ہیں اور اب پندرھویں صدی کا آغاز بھی فکر اقبال کے ثقافتی اثرات سے ہو رہا ہے۔ علامہ کے انتقال کو اس ماہ بیالیس ۴۲ برس ہوتے ہیں۔ اس مدت میں ان کے افکار و خیالات کی تشریح و توضیح پر سینکڑوں مضامین اور صدہا کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ یہ صورتِ حال اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ فکر اقبال عصرِ جدید کا ایک ہمہ جہت جاذب و نادر شاہکار ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ علامہ نے فطرت و کائنات کے وہ تمام رموز جو انسانی فلاح و عروج کے لیے ہیں، شاعرانہ اور فلسفیانہ انداز میں منکشف کر دیئے ہیں جن کی توجیہہ و تفسیر سے مفکرین و مبصرین کو روحانی غذا اور قوتِ عمل نصیب ہوتی ہے۔ اس ضمن میں علامہ اقبال اردو زبان سے مربیانہ حیثیت سے منسلک ہیں اور ہم سے اُردو کے واسطے سے عمل کے خواہاں ہیں۔

ہم نے مانا کہ عصر اقبال سے قبل ہماری قومی شاعری مخصوص اہمیت کی حامل رہی ہے۔ مگر اس سے ہماری زبوں حالی بھی چھپی نہیں ہے۔ علامہ نے روایت سے بغاوت کی اور اُردو کو مسلمانوں کی دیرینہ عظمت و شوکت سے متعارف کرایا۔ علامہ نے قومی اور صوفیانہ شاعری کے متروک اور مخلوط نظریات سے نکل کر خالص اسلامی فعال حقیقتوں کو پیش کیا۔ انھوں نے انسانیت اور اسلامیت کی سرحدوں کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیا اور زبان اُردو کے روشن امکانات کی بشارت دی۔ علامہ کا یہ اقدام ایک بے مثال ادبی معجزہ ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اُردو کی ہمہ جہت خدمت کر کے علامہ مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کریں۔ ہماری کاروباری زندگی میں ابھی تک انگریزی زبان کا غلبہ ہے۔ ہمیں دو سو برس کی رچی ہوئی ذہنی غلامی سے پوری طرح چھٹکارا نہیں ملا ہے۔ اس صورتِ حال کا ذمہ دار بڑی حد تک ہمارا احساس کمتری ہے۔ ہم قومی سطح پر سب کچھ کرنے کو تیار ہیں مگر ذہنی تساہل اور مرعوب فکر کی بنا پر دستِ غیب کی اعانت کے متمنی ہیں۔

اس شمارے کا آغاز علامہ اقبالؒ سے متعلق مضامین سے ہوتا ہے۔ یہ ادنیٰ خراجِ عقیدت ہے جو ہم مرحوم کو پیش کر رہے ہیں۔ ان مضامین کے بعد انجمن ترقی اردو لاہور کے تحت ہونے والی انگریزی، اُردو جائزہ کانفرنس کی روداد شامل ہے جس کے مطالعے سے قارئین کو اُردو زبان کی موجودہ حیثیت اور اس ضمن میں قومی مطالبات سے واقفیت ہو گی۔ اس کانفرنس کے انعقاد اور کامیابی کا سہرا ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے سر ہے۔ ہم نے سائنس اور اُردو کے رشتوں کی وضاحت

کے لیے سائنٹفک سوسائٹی پاکستان کے سالانہ اجلاس کے خطبۂ صدارت کو بھی شاملِ اشاعت کر لیا ہے۔

تعلیمی شعبہ میں انگلش میڈیم اسکولوں کی روز افزوں تولید و افزائش سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے متوازی اُردو اسکولوں کی کوئی مہم جاری نہیں ہے۔ گر معیاری اور اقامتی اُردو اسکول وجود میں آجائیں تو طلبہ اور والدین اُن کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اور اُردو کی قومی حیثیت بھی زیادہ مؤثر ہو سکتی ہے۔

اس ماہ اُردو کے دو ادیب اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ سُرور بارہ بنکوی کا ڈھاکہ میں ۳ اپریل کو انتقال ہوا جہاں وہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں گئے تھے۔ مرحوم انجمن ترقی اردو مشرقی پاکستان سے ۱۹۵۵ء میں وابستہ ہو کر نواب پور روڈ پر انجمن کے کتب خانہ کے انچارج مقرر ہوئے تھے۔ فروغِ اُردو کے سلسلے میں وہ انجمن ترقی اُردو ڈھاکہ، راجشاہی اور چٹگام کے سرگرم کارکن تھے۔ اُن کی ادبی خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی۔ دوسرا صدمہ ڈاکٹر پروفیسر خان رشید کے سانحۂ ارتحال کا ہے۔ جو ۴ اپریل کو رونما ہوا۔ مرحوم انجمن ترقی اُردو کے ہمدرد اور بابائے اُردو کے فدائی تھے۔ مرحوم کی تخلیقی اور علمی صلاحیت بے مثال تھی۔ اِن کی تصانیف اُن کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ مرحومین کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین

سبوچۂ اقبال

فضل القدیر ندوی

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں
کہ خانقاہوں میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی

یہ اور اس طرح کے اور کئی اشعار سے تصوف اور خانقاہی نظام سے اقبال کی بیزاری ظاہر ہوتی ہے، دوسری طرف قدیم مشائخ و شعرائے متصوفین، سنائی، عطار، رومی اور جامی سے استفادے کے رشتہ کا اظہار بھی ملتا ہے۔ فکر اقبال کے مطالعہ کے ان مقامات پر بظاہر جو تضاد نظر آتا ہے، وہ حقیقی نہیں، بلکہ مزعومہ ہے، اس لئے کہ وہ حقیقی تصوف کے حامی بھی تھے، اور مشائخ کی عظمت کے معترف بھی۔ اور یہ اعتراف کسی مخصوص عہد کے صوفیہ تک محدود نہیں، بلکہ مشائخ معاصرین سے بھی افادے، اور استفادے کے تعلقات رہے اور صرف علمی ہی نہیں بلکہ سلسلۂ قادریہ میں وہ مرید بھی تھے،

علامہ کو اپنے عہد کے جن مشائخ سے علمی اور عرفانی استفادے کا تعلق تھا، ان میں متعدد بزرگ تھے۔ مگر مکتوبات کی روشنی میں پیر سید مہر علی شاہ صاحب سجادہ نشین خانقاہ گولڑہ اور مولانا شاہ سلیمان صاحب قادری پھلواری کی شخصیتیں بہت اہم ہیں۔

اول الذکر بزرگ حضرت قمیص قادری کی اولاد میں سے تھے، ان کا شمار سلسلۂ قادریہ کے کبار مشائخ میں ہوتا تھا۔ علوم ظاہری اور باطنی دونوں میں کمال رکھتے تھے، اکتساب فیض کے لئے صرف پنجاب ہی نہیں کابل، قندھار، غزنہ اور ہرات سے بھی لوگ آیا کرتے تھے، ہر چند کہ آپ گوشہ نشین بزرگ تھے، مگر آپ کی خانقاہ میں، تصوف، اور حدیث کی تدریس کا باقاعدہ سلسلہ تھا، اور شاہ صاحب مثنوی رومی کا درس دیتے تھے۔ ثانی الذکر بزرگ تصوف و عرفان ہی نہیں، بلکہ علوم و فنون کا ایک مجسم ادارہ تھے، مشائخ اور علماء کے حلقہ میں امتیازی شہرت رکھتے تھے، ہندوستان کے اس عہد کی دینی، ملی، اور علمی تحریکوں کے ہر موڑ پر ان کی شخصیت بہت نمایاں طور پر نظر آتی ہے،

وہ پٹنہ کے ممتاز ترین، تاریخی قصبہ پھلواری شریف سے تعلق رکھتے تھے۔ جس کو صدیوں سے اکابر اولیاء اور علماء کے مولد و مسکن ہونے کا شرف حاصل ہے،

شاہ صاحب ہندوستان میں سلسلۂ قادریہ کی اہم ترین خانقاہ، مجیبیہ کے سجادہ نشین شیخ الاسلام حضرت نفر قدس سرہٗ کے مرید، مرشد، خلیفہ اور مجاز تھے، اور حضرت مولینا شاہ بدرالدین قدس سرہٗ ان کے جانشین تھے۔

شاہ سلیمان صاحب پھلواروی ؒ نے یوں تو متعدد اشخاص اور درسگاہوں سے درسیات کی تکمیل کی تھی۔ مگر تصوف و عرفان

بالخصوص فتوحات و فصوص، مکتوبات صدی، اور مثنوی کا باقاعدہ درس اپنے پیر و مرشد سے لیا تھا۔ جن کی خانقاہ میں آج تک طالبین کو اذکار و اوراد کے ساتھ ساتھ رسائل و کتب تصوف کی تعلیم دی جاتی ہے؛

ان بزرگوں سے علامہ اقبال کے روابط کی ابتدا بعض صوفیہ کے نظریات کی توضیح و تشریح کے سلسلے میں ہوئی۔ اس ضمن میں ابن عربی کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ جن کے اوصاف و کمالات کے اعتراف کے باوجود بعض افکار سے علامہ کو اختلاف رہا، مثلاً ابن عربی کے نظریۂ وحدۃ الوجود کے برعکس، علامہ کو مجدد الف ثانی کے نظریہ وحدۃ الشہود سے اتفاق تھا، اقبال کے نزدیک ابن عربی کا نظریۂ وحدۃ الوجود، افلاطونی تصور سے ماخوذ تھا، جو حرکت و عمل، اور خودی کے تصور سے مختلف اور متناقض تھا، اس لئے اقبال نے اس کو مسلکِ گوسفندی سے تعبیر کیا؛

راہبِ دیرینہ افلاطون حکیم — از گروہ گوسفندانِ قدیم

گوسفندے در لباسِ آدم است — حکم او بر جانِ صوفی محکم است

قوم ہا از سُکرِ او مسموم گشت — خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

ابنِ عربی سے علامہ کا اختلاف صرف نظریۂ وحدۃ الوجود ہی تک نہیں تھا، بلکہ اس ضمن میں تنزلات ستہ کی بحث بھی آتی ہے پھر ارواح کے قدم سے متعلق بھی ابن عربی کا نظریہ اقبال کے نزدیک قابلِ قبول نہیں تھا۔ ان فکری اختلافات کے باوجود وہ ابن عربی کی مفکرانہ، اور عارفانہ عظمت کے معترف تھے، اور وہ ان سے ذہنی طور پر مستفید بھی ہوئے؛ عابد علی مرحوم نے صحیح لکھا ہے کہ علامہ نے ایران کے مابعد الطبیعیات، اور اپنے خطبات میں استفادہ بھی کیا ہے‘ اور ان کی تردید بھی‘‘ [1]

شیخ محی الدین ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم کا شمار تصوف کی امہات کتب میں ہوتا ہے۔ ہر زمانے میں اس کتاب کی مدح و قدح‘‘ دونوں ہوتی رہی ہے، یہ کتاب اگر ایک طرف عرفائے طریق کے لئے میخانۂ صد رنگ ہے۔ تو دوسری جانب اپنے مضامین و معتقدات کی وجہ سے مطعون بھی، مگر مجد الدین فیروزی کے بیان کے مطابق اس کتاب کے موردِ طعن ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ فصوص الحکم کے اصل نسخہ میں جتنی تدوین ہوئی ہے، شاید ہی کسی دوسری کتاب کے ساتھ اتنا ستم ہوا ہو، ترمیم و تحریف کی ایک طولانی فہرست ہے، جن خانقاہوں میں اس کتاب کی تدریس کا التزام ہے، وہاں صحت کے ساتھ ساتھ ابن عربی کی مدرکات کی قابلِ فہم قرآنی تاویل کا بھی سلسلہ ہے۔

فصوص الحکم کے الفاظ سے طفولیت ہی میں علامہ کے کان آشنا ہو چکے تھے، حضرت شاہ سلیمان صاحب پھلواری رح کے نام علامہ اپنے خط میں رقمطراز ہیں،

’’شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رح کی نسبت کوئی بدظنی نہیں، بلکہ مجھے ان سے محبت ہے۔ میرے والد کو فتوحات اور فصوص سے کمال توغل رہا۔ اور چار برس کی عمر سے میرے کانوں میں ان کا نام، اور ان کی تعلیم پڑتی شروع ہوئی؛ شیخ اکبر سے فکری اختلاف اور حافظ شیرازی سے متعلق علامہ کے خیالات کے ردِ عمل کا سلسلہ مشائخ کے حلقہ میں سبب شروع ہوا، تو خواجہ حسن نظامی کے مشورہ

---

[1] تلمیحاتِ اقبال ص ۱۰۱

رجوع کیا۔[1] علامہ اقبال نصوص کے بعض مقامات کی وضاحت کے لئے علامہ نے حضرت شاہ سلیمان پھلواروی کی طرف پوری دیانت کے ساتھ اپنے مطالعہ پر نظر ثانی کرنا چاہتے تھے۔ یہ عہد ۱۹۱۶ء کا ہے، جب وہ خود تصوف کی تاریخ مرتب کر رہے تھے، علامہ کو اپنی رائے پر اصرار نہیں تھا۔ چنانچہ ابن عربی کے نظریۂ زمان و مکان سے متعلق جب تجسس پیدا ہوا تو انہوں نے پیر سید مہر علی شاہ کی خدمت میں درخواست کی کہ

"میں نے گذشتہ سال انگلستان میں حضرت مجدد الف ثانی پر ایک تقریر کی تھی۔ جو وہاں کے اداشناس لوگوں میں بہت مقبول ہوئی۔ اب پھر ادھر جانے کا قصد ہے، اور اس سفر میں حضرت محی الدین ابن عربی پر کچھ کہنے کا ارادہ ہے۔ نظر بایں حال چند امور دریافت طلب ہیں، جناب کے اخلاق کریمانہ سے بعید نہ ہوگا اگر ان سوالات کا جواب شافی مرحمت فرمایا جائے،

(۱) اول یہ کہ حضرت شیخ اکبر نے تعلیم حقیقت زمان کے متعلق کیا کہا ہے اور ائمہ متکلمین سے کہاں تک مختلف ہے۔

(۲) یہ تعلیم شیخ اکبر کی کون کون سی کتاب میں پائی جاتی ہے، اور کہاں کہاں! اس سوال کا مقصود یہ ہے کہ سوال اول کے جواب کی روشنی میں خود بھی مطالعہ کر سکوں"۔

صرف تصور زمان و مکاں ہی نہیں، بلکہ نظریۂ وحدۃ الوجود پر بھی پیر مہر شاہ صاحب قبلہ سے مکاتبت رہی ہے اور ان سے علمی و عرفانی استفادے کا سلسلہ مدتوں قائم رہا۔

اسی نظریۂ وحدۃ الوجود کی عارفانہ تعبیر و تشریح کے سلسلے میں اور متصوفانہ ذخیرۂ کتب میں اپنی بعض الجھنوں کے سلسلے میں انھوں نے شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کی طرف رجوع کیا۔ تو سب سے پہلے تصوف سے متعلق اپنے نظریہ کی وضاحت کی۔ "درحقیقت اسلامی تصوف کا میں کیونکر مخالف ہو سکتا ہوں کہ میں "خود سلسلۂ قادریہ سے تعلق رکھتا ہوں"۔ پھر شیخ اکبر کے متعلق اپنے ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں،

"لیکن یہ بالکل ممکن ہے کہ میں نے شیخ کا مفہوم غلط سمجھا ہو، کئی سالوں تک میرا یہی خیال رہا، مگر اب میں سمجھتا ہوں کہ میں ایک قطعی نتیجہ تک پہنچ گیا ہوں۔ لیکن اس وقت بھی مجھے اپنے خیال کے لئے کوئی عذر نہیں ہے، اس واسطے بذریعۂ عریضہ ہٰذا آپ کی خدمت میں ملتمس ہوں کہ از راہ عنایت و مرحمت چند اشارات تسطیر فرما دیں میں ان اشارات کی روشنی میں فصوص و فتوحات کو پھر دیکھوں گا، اور اپنے علم و رائے میں مناسب ترمیم کر لوں گا"۔

اس علمی استفادے کے دوران حضرت شاہ سلیمان پھلواروی "سے عقیدتمندانہ تعلق ہو گیا ہے۔ ان کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"آپ کو اللہ تعالیٰ نے کمال روحانی کے ساتھ علم و فضل سے آراستہ کیا ہے"۔[2] اور اس اعتراف کے ساتھ ساتھ یہ آمادگی بھی دوسرے خط سے ظاہر ہوتی ہے کہ اگر شاہ صاحب قبلہ وحدۃ الوجود کی شرح و بیان اپنے انداز سے فرماتے رہیں، تو حضرت شیخ اکبر سے ان کو کوئی اختلاف نہیں رہے گا۔

---

[1] اقبال کے محبوب صوفیہ ص ۱۶ اعجاز الحق قدوسی [2] انوار اقبال بشیر احمد ڈار ص ۸۷

"آپ کے مکتوبات نہایت دلچسپ ہیں، اور حفاظت سے رکھنے کے قابل نہ کہ ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کے قابل میں نے خود ان کو پڑھا ہے، اور بیوی کو پڑھنے کے لئے دیا ہے، یہ اعتراف ضرور کرتا ہوں کہ بعض بعض مقامات سے مجھے اختلاف ہے، اور یہ سب مقامات وحدۃ الوجود سے تعلق رکھتے ہیں، جب آپ اپنے مضمون میں زیادہ تشریح سے کام لیں گے تو شک ہے مجھے اختلاف نہ رہے"۔

تصوف اور فلسفۂ اسلام کا ارتقا دوش بدوش ہوا ہے۔ گیارہویں صدی ہجری میں تو تصوف نے ایک عالمگیر تحریک کی صورت اختیار کرلی، ہر چند کہ اس میں عجمی فلسفہ کی آمیزش بھی ہوتی رہی ہے، پھر بھی خالص اسلامی تصوف کے مراکز ہر عہد میں اپنی ساری خصوصیات کے ساتھ قائم رہے ہیں، یہ اور بات ہے کہ زوال و انحطاط کے اثرات سے تہذیب و ثقافت کے دیگر سرچشموں کی طرح تصوف بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ لیکن صوفیہ کے جس طبقہ نے فلسفۂ اشراق سے اپنی تعلیمات کو ممیز رکھا، اور اپنے فکر و عمل کا محور قرآن و سنت ہی کو قرار دیا، ان کا رشتہ عوام سے بہت گہرا اور ان کا پیام آفاقی رہا، وہ غیر اسلامی اقدار و افکار سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہے۔ علامہ اقبال کو ایسے تمام مشائخ و صوفیہ سے گہری عقیدت ہے، ان کے کشکول خالی نہیں ہیں۔ بلکہ معارف کے گہر ریزے آج بھی موجود ہیں۔

قاموس الکتب

کے دوسرے جلد

جس میں تاریخ و سوانح، سفرنامے وغیرہ کے موضوعات پر تقریباً چار ہزار کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ تمام کتابیں ابواب میں تقسیم کردی گئی ہیں ساتھ ہی ایک اشاریہ اور وضاحتی فہرست بھی منسلک ہے جس سے مطلوبہ کتاب کی تلاش میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔

کاغذ و طباعت عمدہ۔ ضخامت ۶۲۸ صفحات

قیمت : چالیس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی ۱

اقبالؔ کا نظریۂ فن

محمد صادق امتیاز، ایم اے

اقبال ایک ایسے مایۂ ناز مسلمان شاعر ہیں جنہوں نے مشرق و مغرب کے تاریخی، تہذیبی اور تمدنی سرمائے اور مختلف فلسفیانہ افکار کا بغور مطالعہ کیا۔ انہیں پرکھا اور پھر اسلام کی روشنی میں اپنی متوازن اور تعمیری فکر کی بنیاد رکھی۔ لیکن جہاں دین و تمدن، عقل و عشق، حیات و تقدیر، حقیقت و مجاز، عمل و قوت اور مختلف سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے بارے میں اپنے بصیرت افروز خیالات کے اظہار کے لئے شاعری کو وسیلہ ٹھہرایا۔ وہاں انہوں نے فن اور فنکار کے بارے میں بھی ایسے اصول متعین کئے۔ جن پر چل کر ایک فنکار اپنے معاشرے اور قوم و ملت کے لئے باعثِ افتخار اور اس کا فن جزوِ پیغمبری کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔

اقبال نے جس زمانے میں اپنی شاعری کا آغاز کیا وہ عبوری عہد کی شکست و ریخت سے گزر رہا تھا۔ مختلف بزرگانِ دین اور اکابرینِ ادب ایک بہتر زمانے کی تشکیل کے لئے بنیاد رکھ چکے تھے۔ سید احمد بریلوی اور ان کے رفقا نے دینی انداز سے معاشرے کی اصلاح کے لئے کوششیں کیں۔ اور پھر سرسید احمد خاں اور ان کے رفقائے کار نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ان کے اثرات نہ صرف سیاسی بلکہ تمدنی اور ادبی شعبوں پر بھی مرتب ہوئے۔ اور خصوصاً حالی وہ پہلے فن کار ہیں جنہوں نے فن کو مقصدیت سے آشنا کیا۔

دوسری جانب یورپ کے مختلف ممالک میں مقصدیت کے خلاف تحریک شروع ہو چکی تھی۔ جس کے سربراہ فرانسیسی فلابیئر (FLAUBERT)، گوتیئر (GAUTIER) اور بودلیئر (BAUDELARE) تھے۔ انگلستان میں والٹر پیٹر (WALTER-PATER) اور امریکہ میں ایڈگر ایلن پو (EDGAR ALLEN POE) نے اسے پروان چڑھایا۔ فن برائے فن اس تحریک کا نعرہ تھا۔ ان کے نزدیک حسنِ فن کا خاصہ تھا۔ اور اس سے اخلاق، تعلیم، روپیہ پیسہ اور شہرت کا مطالبہ کرنا بے سود تھا۔ یہی وجہ ہے گوتیئر (GAUTIER) کہتا ہے:

"ہم فن کی آزادی کے قائل ہیں۔ ہمارے نزدیک فن بذاتِ خود ایک مقصد ہے۔ نہ کہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ۔"

اس سے ملتی جلتی ایک تحریک "ہیئت برائے ہیئت" کی علمبردار تھی۔ ان کے نزدیک حسن اجزا میں نہیں ہوتا بلکہ ان اجزا کی باہمی تشکیل میں مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی راگنی اپنی سُروں کی بنا پر حسین نہیں کہلاتی بلکہ اس کے حسن کا راز اس متناسب امتزاج میں مضمر ہے جس میں اس کو ترتیب دیا گیا ہو۔

اس طرح ایک تحریک رومانیت پسندوں کی چلی تھی۔ جو دنیا سے اپنا رشتہ ناطہ توڑ کر تخیلاتی دنیا میں گم ہو جانے کا رجحان تھا۔ اور نفسیاتی دبستان والوں کو فن سے تعلق نہیں تھا۔ ان کا مقصد صرف فرد کی نفسیاتی گرہوں کو کھولنا تھا۔ گویا ان میں سے ہر تحریک صرف ایک پہلو پر زور دیتی تھی۔

اقبال نے ان تمام نظریہ ہائے فن کے مطالعہ کی روشنی میں جس نظریۂ فن کی بنیاد رکھی۔ اس کا زیادہ تر دارومدار اگرچہ مقصدیت

روایت پر تھا۔ تاہم انہوں نے فن کے جمالیاتی تقاضوں اور فنکار کی شخصیت کے پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔ بلکہ مختلف پہلوؤں کے متوازن امتزاج سے مثالی نظریہ ہیں تشکیل دیا۔

دراصل، ادب کی تفہیم، توجیہہ اور تجسس تین پہلوؤں پر مبنی ہوتا ہے۔

۱۔ فن ۔ ۲۔ معاشرہ ۔ ۳۔ فنکار۔

معاشرہ فن کار کو متاثر کرتا ہے۔ اور فنکار معاشرے سے حاصل شدہ تاثرات کو اپنے فن کے ذریعہ بیان کرتا ہے۔ اور فن اپنے اظہار کے بعد دوبارہ معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس طرح ایک دائرہ بنتا رہتا ہے۔ جس میں کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کے تمام نظریاتِ فن دو اقسام کے تحت آتے ہیں۔

۱۔ فن برائے فن ۔ ۲۔ فن برائے زندگی۔

فن برائے فن والے معاشرے کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور صرف فنی حسن پر زور دیتے ہیں۔ جبکہ فن برائے زندگی کے قائل محض اخلاقیات اور معاشرتی مسائل کی تبلیغ و پرچار کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ اور یوں فن کی جمالیاتی قدروں اور فن کار کی شخصیت کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اور صرف چند بندھے ٹکے اصولوں کا پرچار ہونے لگتا ہے۔ اور ادب کی حیثیت ایک طرف محض حسن اور دوسری جانب محض پرچار ہو کر رہ جاتی ہے۔ اقبال نے اپنے نظریۂ فن میں ان دونوں پہلوؤں پر توجہ دی اور فن اور مقصد کا حسین امتزاج قائم کیا۔

اقبال کے تمام نظریات کا مرکزی نقطہ "خودی" ہے۔ اور یوں ان کا نظریۂ فن بھی خودی کے نظریہ سے وابستہ ہو کر مزید واضح اور مربوط ہو گیا ہے۔ اس بارے میں اقبال کے ایک مستند نقاد نے کہا تھا کہ اقبال کا نظریۂ فن خودی سے مل کر بھسم ہو گیا ہے۔ لیکن بنظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نقاد صاحب نے اس سلسلے میں زیادہ احتیاط سے کام نہیں لیا۔ حالانکہ اقبال کے جتنے افکار بھی ہیں ان کا محوری و مرکزی نقطہ خودی ہی ہے۔ اور اُن کا نظریۂ فن بھی ان کے نظریۂ خودی کا شاخسانہ ہے۔ ان کے نزدیک ہر فن کا مقصد زندگی کی تاریکیوں میں نور بھرنا اور اسے حیاتِ ابدی کا سوز بخشنا ہے۔ اسے انقلاب کی لذتوں سے آشنا کرنا اور ہر آن ایک نئے دور کی جستجو میں آوارہ رکھنا ہے۔ اور جو فن خودی کی تعمیر و ترتیب میں حصّہ نہیں لیتا۔ وہ محض فسوں و فسانہ ہے۔ اور اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر — گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات — نہ کر سکیں تو سراسر فسون و افسانہ

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر خودی کی تعمیر و ترتیب کیسے ہوتی ہے؟

انسان کے اندرونی جوہر اور صلاحیتوں کے مجموعے کا نام خودی ہے۔ صلاحیتیں عمل سے پیدا ہوتی ہیں اور عمل کی ترغیب آرزو سے ہوتی ہے۔ اور یہی آرزو اور امنگ ہی وہ جوہرِ حقیقی ہے جو دلوں میں جذبات و احساسات اور افکار و خیالات غرضکہ ادب پیدا کرتی ہے۔ زندہ دلی بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور زندہ دلی ہی اصل میں زندگی ہے۔

ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم — از شعاعِ آرزو تابندہ ایم
جانِ ما را لذّت اندر جستجوست — شعر را سوز از مقامِ آرزوست

دلِ مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

یہی چیز جو اقبال کے نزدیک ادب میں نہیں ہونی چاہیئے وہی چیز ہماری شاعری اور ادب کی بنیاد رہی ہے یعنی تنوطیت ہمارے تمام شعراء کی شاعری کا زیادہ تر حصہ مایوس کن۔ ماتمی اور المیہ رہا ہے۔ اس دورِ انحطاط کی قنوطی شاعری کی سخت مخالفت کی ہے۔ اقبال نہ صرف شاعر اور حکیم فرزانہ تھے بلکہ انسانی فطرت کے صحیح نباض بھی تھے۔ اور بحیثیت ماہر نفسیات اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ مایوسی سے عزم و ارادہ کی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ اور انسان کی عملی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ اقبال نے اس کا ذکر مختلف جگہوں پر کیا ہے۔ محمد طاہر فاروقی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اس کا حوالہ دیا ہے۔[۱]

"فن زندگی کے ماتحت ہے۔ ہر چیز کو انسانی زندگی کے لئے وقف ہو جانا چاہیئے۔ اس لئے ہر وہ فن جو زندگی کے لئے مفید ہو اچھا اور جائز ہے۔ اور جو زندگی کے خلاف ہو جو انسانوں کی ہمت کو پست کرے اور ان کے جذبۂ عالیہ کو مردہ کرنے والا ہو۔ قابل نفرت اور لائق پرہیز ہے۔"

اسی طرح "مرقع چغتائی" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں جس کا حوالہ ایک مضمون میں ملتا ہے[۲]

"ایک انحطاطی فنکار ملک و ملت کے لئے اطیلا اور چنگیز کی ایک پوری بٹالین سے زیادہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کا فن لوگوں کو اس کے نغموں اور تصویروں کی طرف راغب کر سکے۔"

چنانچہ جہاں کہیں بھی انہوں نے اپنا نظریہ پیش کیا وہاں اپنے اس خیال کو ظاہر کیا کہ فن اور شاعری کا مقصد ہمیشہ اعلیٰ ہونا چاہیئے۔ تاکہ فنکار یا شاعر اپنی قوم کے دلوں سے مایوسی اور ناامیدی کو دور کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ خود ان کا اپنا کلام رجائیت کی عمدہ مثال ہے۔

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحر خیز

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے غلامی اور رہبانی تصورات کی بھی سخت مخالفت کی ہے۔ غلامی سپہر کبود کی ہو یا اسود و احمر کی۔ چوب نے کی ہو یا کسی اور چیز کی انسان کے حق میں زہر ہلاہل ہے۔ یہ پردہ سامنے آجائے تو فکر میں الجھن اور نظر میں تاریکی پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ادب کا فراری یا رہبانی رجحان بھی حیات کش اور رجعت پسندانہ ہے۔ جس میں مجبوری محض۔ دنیا کی بے ثباتی۔ بے بسی و بے چارگی کا احساس دلایا جاتا ہے۔

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

فن تنقید کے بعض دبستانوں نے فن کا مقصد حظ آفرینی قرار دیا ہے اور بعضوں کے نزدیک اس کا مقصد محض حظ آفرینی ہی نہیں حسن آفرینی بھی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ دونوں ایک چیز کے دو نام ہیں۔ اس نظریے کے تحت ایسا ادب پیدا ہوتا ہے

---

[۱] خونِ جگر کی نمو۔ محمد طاہر فاروقی رسالہ ماہ نو اقبال نمبر ستمبر ۱۹۷۷ء
[۲] فلسفۂ اقبال۔ میاں محمد شریف ترجمہ سجاد رضوی مضمون۔ اقبال کا نظریۂ فن

جس میں ظاہری آرائش و زیبائش کا اہتمام تو ہوتا ہے۔ لیکن روحِ حیات سے عاری ہوتا ہے۔ اس میں جذبہ مفقود ہوتا ہے اور اس ادب کی حیثیت ایک ایسے کاغذی پھول کی مانند ہوتی ہے جس میں خوبصورتی تو موجود ہوتی ہے خوشبو نہیں ہوتی۔ گویا اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے۔

اقبال شاعرِ حیات ہے۔ اور اس کی شاعری میں جمال کے ساتھ جلال اور قوت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اور اس کے لئے عشق ایک ایسا وسیلہ ہے جو انسان کو معراج عطا کرتا۔ اسے مستحکم بناتا۔ اور موجودات کی تسخیر پر آمادہ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ فن میں ایسی آگ چاہتے ہیں جس کا شعلہ تند و سرکش ہو۔ بیتاب ہو۔ اور اثر کرنے والا ہو۔ اور انہیں ایسا ہنر مرغوب نہیں جس میں ضربِ کلیمی نہ ہو۔ جو قوت و شوکت عطا نہ کر سکے۔ اور جو انقلاب نہ لا سکے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اقبال نے ایسے ادب کو قوموں کے لئے مہلک قرار دیا ہے۔ محمد طاہر فاروقی صاحب نے اقبال کا قول نقل کیا ہے۔ [2]

”جب کوئی قوم زوال پر آمادہ ہو جاتی ہے تو ٹھوس چیزوں سے۔ مغز سے۔ معنی سے بیگانہ ہو جاتی ہے۔ چھلکے سے شکل سے دل بستگی بڑھ جاتی ہے۔ یہی فن کا زوال ہے۔“

گویا اقبال نے اپنے فن میں جلال و جمال کا حسین امتزاج پیدا کیا ہے۔ وہ فن میں جمال کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن جمال کے ساتھ جلال کو بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔

ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دلآویز — اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر — نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک

حسن آفرینی و حظ آفرینی کے ساتھ ساتھ اقبال نے جنسیت کی بھی مخالفت کی ہے۔ اقبال کے نزدیک فن میں جنسیت کا پہلو فنکار کے دل و دماغ پر پردہ ڈال دیتا ہے اور شاعر پورے معاشرے کو جنسی لعنت میں گرفتار کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنے کلام میں جا بجا اس رجحان کی مخالفت کی ہے۔

؎ ہند کے شاعر و صورتگر و افسانہ نویس — آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار
عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا — ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

یہی وجہ ہے کہ اقبال شاعری کو اخلاق کے ماتحت قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک صحیح فنکار وہ ہے جو انسان کو صفاتِ خداوندی کا مرتفع بنانے کا مقصد لئے ہوئے ہو۔ اور انسانوں کو آرزوؤں کے ایک لامتناہی سلسلے سے آشنا کرے۔ جس کا حوالہ ایک مضمون میں ملتا ہے۔

---

[1] فلسفۂ اقبال - میاں محمد شریف مترجمہ سجاد رضوی - اقبال کا نظریۂ فن

[2] خلقِ مکرر کی شر - محمد طاہر فاروقی - رسالہ ماہِ نو اقبال نمبر ستمبر ۱۹۷۷ء

"وہ شاعر جو انسانیت کے لیے رحمت بن کر آتا ہے خدا کا ہلکارہ ہوتا ہے۔"

چنانچہ اقبال اس بات کے قائل دکھائی دیتے ہیں کہ فن کار کا فرض ہے کہ وہ اپنے فن کے ذریعے روحانی اور اخلاقی اقدار پیدا کرے جس سے ایک صحت مند قوم وجود میں آسکتی ہے۔

مختلف نقادوں کے نزدیک فن فنکار کی شخصیت کا مظہر اور ترجمان ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ فن کار کے فن میں تجربے کا خلوص شامل ہوتا ہے۔ اور فن کار کے لیے لازم ہے کہ وہ وہی چیز پیش کرے جس کا اسے تجربہ ہو۔ اس تجربہ نے اس کے دل میں ایک خلش پیدا کر دی ہو۔ چنانچہ وہی فن آفاقیت و ابدیت کا حامل ہو سکتا ہے جس میں فنکار کی شخصیت شامل ہو جائے اقبال نے اظہارِ ذات کے اس مسئلہ کو فن کار کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس نے جہاں تقلید کی مخالفت کی وہاں خونِ جگر کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔

اقبال کے نزدیک فن کو تقلیدی ہونے کی بجائے تخلیقی ہونا چاہیے۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک فن کار اپنی آنکھوں سے واقعات کا مشاہدہ نہ کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ اقبال کے نزدیک انسان نیچر سے عظیم تر ہے اور اس کا کام فطرت کی نقالی کی بجائے اس کو سنوارنا ہے۔

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی — رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے
دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے — افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے
اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی — کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت — جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے تھیٹر اور ڈرامے کی مخالفت کی ہے۔ کیونکہ اس میں انسان کسی اور کی نقل کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی شخصیت ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس کی خودی کی نفی ہوتی ہے۔

حریم تیرا خودی غیر کی معاذ اللہ — دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے — رہا نہ تو تو نہ سوزِ خودی نہ سازِ حیات

اس طرح اقبال خونِ جگر کو بھی فن کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں۔ مختلف فنون میں تاثیر کی گرمی اور گداز کی لچک اور گھلاوٹ جن اشاروں، کنایوں اور رموز سے پیدا ہوتی ہے وہ اسی محنتِ پیہم کا نتیجہ ہے، فلسفہ صرف دماغ سوزی کی پیداوار ہوتا ہے اس میں زندگی نہیں ہوتی۔ جس میں نے نواز کا سوزِ دروں اور دل کی آنچ نہیں اور جو دل کی گہرائیوں سے نہیں پھوٹتا وہ جاوداں نہیں بن سکتا۔ گویا ادب اور زندگی دونوں کے لیے خونِ جگر ضروری ہے۔ اقبال نے اس کا ذکر یوں کیا ہے

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا — روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد
خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر — میخانۂ حافظ ہو کہ بتخانۂ بہزاد

اقبال نے اپنی مشہور نظم "مسجد قرطبہ" میں اس کی اہمیت کو یوں واضح کیا ہے۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

قطرۂ خونِ جگر سل کو بناتا ہے دل　　خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

غرضیکہ اقبال کو ہر وہ نغمہ و شعر پسند تھا جو غلام قوموں کو بیدار کرتا اور انہیں اُٹھنے اور جدوجہد کرنے کی تعلیم دیتا اور انہیں ہر اس نغمے سے نفرت تھی جس سے انسانوں کو محکوم، مجہول اور حیوان بننے میں مدد ملے۔

انجمن ترقی اُردو پاکستان کی ایک نادر پیشکش

اُردو - انگریزی لغت

مرتّبہ

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق

اس لغت کی ضرورت ایک مدت سے محسوس کی جا رہی تھی اور ایک خاص طبقے کی طرف سے بار بار اس کی اشاعت کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ جس میں اساتذہ اور طلبہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۰۸۰ صفحات کی اس ضخیم لغت نے اس ضرورت کو بھی پورا کر دیا جو اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے والوں کو پیش آتی ہے۔ لغت میں اردو الفاظ کے ماخذ اور صحیح تلفظ رومن رسم خط میں درج ہیں۔

انجمن ترقی اُردو پاکستان

بابائے اُردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

ورق تازہ

ریاض صدیقی

اقبال نے فکری اور نظریاتی سفر کا آغاز ہندوستانی قوم پرست کی حیثیت سے کیا۔ یورپ سے واپسی کے بعد انہوں نے ہندوستانی قوم پرستی کی راہ ترک کر دی اور "پان اسلامزم" کے مبلغ بن گئے۔ "اتحادِ اسلامی" ان کی فکر و نظر کا مرکز بنا اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے اقبال نے ہر سطح پر کام بھی کیا۔ اسلام کی حقیقی قدروں اور افکار و نظریات کو جدید سائنس اور بین الاقوامی اثرات کے تناظر میں از سرِ نو پیش کرنے کی خاطر انہوں نے لاتعداد مضامین لکھے۔ مختلف جلسوں میں تقاریر کیں۔ اور خطوط کے ذریعے رابطے قائم کئے۔ مدراس کے خطبات اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ مدراس لکچر کا دور ۱۹۲۹ء کا زمانہ ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب "اتحادِ اسلامی" کا حقیقی پس منظر ان کے ذہن میں بالکل واضح تھا اور وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک عالمگیر وحدت تصور کرتے تھے۔ اس جذباتی ہیجان[1] کا اظہار ایک اخباری انٹرویو سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے سنہ ۱۹۳۱ء میں انگلستان جاتے ہوئے بمبئی کرانیکل کے نمائندے کو دیا تھا۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں خطبہ الٰہ آباد کے بعد اقبال کے یہاں "اتحادِ اسلامی" کے اس مفہوم میں تبدیلی رونما ہوئی جس کے فروغ میں وہ منہمک تھے۔ اس تغیر کا اظہار بعض خطوط اور ان[2] بیانات میں ہوا ہے جو آل انڈیا کانفرنس لاہور میں دیئے گئے۔

ر۔ص۔

مدراس ۷ رجنوری ۱۹۲۹ء ۵ رجنوری کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک بھاری تعداد ڈاکٹر محمد اقبال کی تقریر سننے کے لئے گوکھلے ہال مدراس میں جمع ہوئی۔ تقریر کے مقررہ وقت یعنی شام ساڑھے چھ بجے سے بہت پہلے ہی ہال کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ شرکا میں لاتعداد لوگوں کے علاوہ جو معزز حضرات موجود تھے ان میں مدراس کے اسسٹنٹ پوسٹ ماسٹر جنرل اعظم۔ مدراس کارپوریشن کے افسر مال محمد زندا

---

[1] گیٹرز اینڈ رائٹنگز آف اقبال" مصنفہ بی اے ڈار ص ۵۔ [2] ص ۵۰ اقبال کی مسلم آؤٹ لک۔ سیاست اور انقلاب کے ایڈیٹروں سے ملاقات بمقام لاہور۔ پنجاب سندھ سرحد اور بلوچستان کے لوگوں کی کانفرنس کا انعقاد اور اقبال کی صدارت۔ مراسلہ بنام "قائد اعظم مؤرخہ ۲۱ رجون ۱۹۳۷ء۔ اس خط میں خاص طور پر واضح کیا گیا ہے کہ تحریک پاکستان سے ان صوبوں کے مسلمانوں کو دور رکھا جائے جہاں مسلمان اقلیت

 قومی زبان

صاحب۔ خان بہادر قادر نواز۔ خان بہادر عبدالکریم۔ خان بہادر عزیز الدین قادری۔ قریشی صاحب۔ ڈاکٹر اجد الدین۔ مصطفیٰ صاحب پیران محی الدین صاحب۔ محمد صاحب۔ ڈاکٹر پی سبارویاں۔ شری سیو راج صاحب۔ شری ایس ایس سریانارایا شاستری۔ شریمتی خدیجہ یعقوب حسن صاحبہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ جلسے کی کارروائی شروع کرتے ہوئے حمید حسن صاحب نے ڈاکٹر پی سبارویاں صاحب سے جلسہ کی صدارت کے لئے کہا۔ ڈاکٹر موصوف نے تعارفی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس جلسے کی صدارت کے لئے ایک غیر مسلم کو منتخب کرنا میرے لئے باعثِ تعجب ہے۔ بہر حال بحیثیت ایک ہندوستانی اور اس سے بھی زیادہ ایک مشترک خدا پر یقین رکھنے والے کے جس نے پوری کائنات تخلیق کی ہے۔ میرے لئے یہ اعزاز غیر معمولی واقعہ اور ناقابلِ فراموش یادگار لمحہ ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ اس جلسے میں جہاں ڈاکٹر محمد اقبال جیسی شخصیت موجود ہے میں اسلام کے سنہری اصولوں سے اور زیادہ آگاہی حاصل کروں گا۔ اس ملک کے لیے جو حصولِ آزادی کی جدوجہد میں منہمک ہے۔ اور خود ہم سب کے لئے جنہیں حصولِ آزادی کے بعد تحفظ آزادی کی ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں لازم ہے کہ ایسے تمام انتظامات کریں جو اس ملک کی دو بڑی قوموں میں اتحاد یگانگت اور برادری کا شعور پیدا کریں۔ میں نے ہمیشہ اور بار بار ہندوؤں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کی ہر مرحلے پر ہمت افزائی کریں۔ اور ان کا سہارا بنیں۔

میں یہاں آیا ہوں تاکہ اسلام کی روشنی سے استفادہ کرسکوں۔ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا عیسائی مختلف طریقوں سے سچائی کے متلاشی ہیں۔ اور سارے مذاہب اس تلاش میں ایک مشترک مقام پر آکر باہم متحد ہوجاتے ہیں۔ اسلام خوبیوں کا گلدستہ ہے اس کا ایک روشن پہلو عالمگیر انسان دوستی کا تصور ہے۔ ہمارے یہاں اہل ہنود میں نسل اور ذات پات کی بنیاد پر سماجی تقسیم کی روایت نہایت افسوسناک حقیقت ہے جب کہ یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ اس کرۂ ارض پر پیدا ہونے والے انسان کو ان بنیادوں پر تقسیم نہیں کر سکتے۔ ایسا کرنا غیر مہذب اور وحشیانہ فعل ہے۔ اسلام کی سربلندی کا ایک ثبوت یہی ہے کہ اس نے تاریخ انسانیت میں پہلی بار نسل ذات اور خاندان کی بنیادوں پر قائم ساری تقسیم کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا اور عالمگیر انسانی وحدت کے عمل کو سچ کر دکھایا۔ برصغیر میں ہندو قوم نے بھی مساوات۔ اخوت اور بھائی چارے کا شعور اسلام ہی سے مستعار لیا ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں مزید کچھ کہنے کا خود کو اہل نہیں سمجھتا ہوں۔ اس تقریر کے بعد صدر جلسہ اور مہمان مقرر اقبال کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ مدراس کے گورنر کا ایک پیغام پڑھ کر سنایا گیا۔ آخر میں شیخ محمد اقبال تشریف لائے۔ اور یوں مخاطب ہوئے۔ "مذہب کی بنیاد یقین اور سپردگی

میں ہیں۔ اگست ۱۹۲۷ء میں پنجاب مسلم فیڈریشن کا علیحدہ قیام جو اقبال کی تجویز کا نتیجہ تھا۔ آل انڈیا کانفرنس میں پڑھے گئے بعض خطبات غالباً تلف کر دیئے گئے۔ اقبال نے آبادیوں کے تبادلے کی تجویز کو بھی رد کیا تھا اور کہا کہ یہ تجویز لالہ لاجپت رائے کی ہے۔ ان مسائل پر پروفیسر عبدالسلام خورشید نتائج قلمبند کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "ڈو نارتھ ویسٹ مسلم کانفرنس کی تجویز اور مسلم اقلیتی صوبوں کو نظر انداز کرنے کی تجویز میرے اس خیال کو ثابت کرتے ہیں کہ علامہ مسلم اکثریتی صوبوں کو ... جہد کو الگ خطوط پر چلانا چاہتے تھے۔ علامہ نے جو کچھ کہا اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ۱۹۴۰ء میں قرارداد لاہور کی منظوری کے بعد مسلم لیگ کے دو حصے ہو جاتے۔ اکثریتی صوبوں کی لیگ اقلیتی صوبوں

ہے۔ سپردگی اور یقین کمزور عقیدے سے برتر قوتیں ہیں۔ عقیدہ جب یقین اور سپردگی سے ہم آہنگ ہوتا ہے تو ہماری داخلی فکر (INNER THOUGHT) اور عملی کردار کا تعین ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی سچائی ازلی و ابدی سچائی ہوتی ہے۔ طبیعیاتی سائنس کسی مسئلے کو تجربات و مشاہدات کے بعد غلط قرار دے سکتی ہے۔ لیکن مذہب کے مسائل اس قسم کی غلطی سے پاک ہوتے ہیں۔ مذہب اسلام کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو یقین آجائے گا۔ یہ نہایت جامع اور عقل و دانش پر مبنی نظام حیات ہے اور ہر شخص عام زندگی میں اس پر آسانی کے ساتھ عمل کر سکتا ہے۔ اسلام کے افکار و نظریات اور لائحۂ عمل کی تعبیر و تشریح کا سرچشمہ تعلیمات نبوی ہیں۔ قدیم یونانیوں کی فکری موشگافیاں ان کی مابعد الطبیعیات میں کوئی انقلاب پیدا نہ کر سکیں۔ یونان کے اہل فکر پر تصوف کے اثرات غالب تھے۔ یہاں تجریدیت اور ابہام ہے جس نے فلسفیانہ انداز نظر اختیار کر لیا ہے۔ اسلام اس کے بالکل برعکس صرف ان اشیاء و عوامل کی نشاندہی کرتا ہے جو عقل و فہم کے دائرے سے باہر نہیں ہیں۔ گذری ہوئی صدیوں میں اسلامی افکار کی تعبیرات ہر نوعیت کے اختلافات سے یکسر پاک تھیں۔ آج جب علوم و افکار کے نئے نئے دھارے اور سائنسی انکشافات سے پیدا ہونے والا فکری تناظر مذاہب کو بے دخل کر رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ نئے پس منظر میں اسلامی حقائق کو از سر نو سمجھنے اور دنیا کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔

ڈاکٹر اقبال نے تقریر جاری رکھتے ہوئے قرآن کریم اور اناجیل کے درمیان فرق کو بھی بیان کیا اور اسلامی فکر پر مزید بحث کی۔ تقریر کے بعد ان کا شکریہ ادا کیا گیا۔ اور اجلاس برخاست ہو گیا۔ دوسرا اجلاس اتوار مؤرخہ ۸ جنوری ۱۹۲۹ء بوقت شام چھ بجے گوکھلے ہال میں منعقد ہوا۔

(۱) انگریزی متن بحوالہ "لیٹرز اینڈ رائٹنگز آف اقبال" ص ۵۲ - ۹۰ مطبوعہ اقبال اکیڈمی ۱۹۶۷ء سے براہ راست ترجمہ۔

کی لیگ۔ دونوں ایک دوسرے کی دست و بازو بنتیں۔ اگر ایسا ہو جاتا تو شاید بعد کے المناک حادثوں سے گریز ممکن ہوتا (غالباً مراد بھارت کے مسلمانوں کی ہجرت سے ہے۔ اور یہ باور کرانا ہے کہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد علامہ کے نقطہ نظر کی نفی کرتی ہے) مجھے یقین ہے کہ اگر علامہ زندہ رہتے تو جد و جہد کے دو رخ ضرور متعین ہوتے۔

صحیفہ جلد ۲ ص ۲۰ - ۲۱ - مطبوعہ جنوری ۱۹۷۳ء لیٹرز اینڈ رائٹنگز آف اقبال مصنف بشیر احمد ڈار ۱۹۶۷ء مطبوعہ اقبال اکیڈمی۔ خطوط اقبال مرتبہ سید نذیر نیازی اقبال اکیڈمی ۱۹۵۷ء - انق ص

اردو کی منظوم داستانیں

تحریر

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

خطبہ صدارت انگریزی اُردو جائزہ کانفرنس

عالی جناب جسٹس شمیم حسین قادری
جج ھائی کورٹ لاھور

خواتین و حضرات

میں ڈاکٹر سید عبداللہ اور جناب حکیم محمد سعید صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے اس مجلس میں بُلا کر آپ سے ملنے کا موقعہ عطا کیا۔ آپ حضرات قومی زبان اُردو کو اس کا حق دلوانے کے لئے جس جوش و خروش سے کام کر رہے ہیں، خدا تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے، یہ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اُردو کا مسئلہ ابھی زندہ ہے اور ہماری کوئی حکومت اسے نظر انداز نہیں کر سکی۔

سید صاحب نے اپنے خطبے میں اُردو کے موجودہ مسائل و مشکلات کا جس تفصیل کے ساتھ ذکر کر دیا ہے اس کے بعد میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ حکومت اور دفتروں کے سربراہوں کو ان کی طرف جلد متوجہ ہونا چاہیئے اور مجھے یقین ہے کہ حکومت اس معاملے میں غافل نہ ہوگی اور جائز شکایات کو دُور کرنے کی تدبیر کر رہی ہوگی۔

آپ حضرات کو معلوم ہے کہ صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے ایسی ہی مشکلات کو دُور کرنے کے لئے ایک بااختیار قومی زبان اتھارٹی قائم کر دی ہے جو بیان کردہ جملہ مسائل حل کرنے کے اختیارات رکھتی ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ جس طرح ہم نے اس سے قبل اُردو کو سرکاری زبان بنوانے کی کوششوں میں استقلال اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا ہے۔ اب ہمیں صبر، امید حوصلے اور اعتماد کا رویہ اختیار کرنا چاہیئے اور اس اتھارٹی کی سفارشات پر آخری حکم صدر مملکت کا ہوگا اس کا انتظار کرنا چاہیئے۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ان کے حکم کے بعد کون اس کی تعمیل سے روگردانی کر سکتا ہے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ قومی زبان اتھارٹی نے اپنا کام شروع کر دیا ہے، اس کے اب تک دو اجلاس ہو چکے ہیں جن میں کام کا خاکہ تیار کر لیا گیا ہے اور اُردو کو عملی طور سے سرکاری زبان بنانے کے لئے دس ذیلی کمیٹیاں قائم کر دی گئی ہیں مثلاً دفتری زبان، کاروباری و عدالتی زبان، طباعت اور ٹائپ مشینری، ذریعہ تعلیم، امتحانات مقابلہ، طباعت و اشاعت، مجلسِ ابلاغِ عامہ اور مجلس رابطہ صوبائی۔

ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کے مطابق ہر سب کمیٹی نے اپنا کام شروع کر دیا ہے . . . . اور شاید آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ دفتری کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر سید عبداللہ ہی ہیں کہ وہ جس کام کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں، اس کی تکمیل کے لئے دن رات ایک کر دیا کرتے ہیں ظاہر ہے کہ اتنا بڑا اور وسیع کام ایک دو

لے انگریزی اردو جائزہ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس (۹ مارچ ۱۹۸۰ء) میں بمقام فلیٹیز ہوٹل پڑھا گیا۔

دن میں تو ہو نہیں سکتا، لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر اتھارٹی نے جوش و خروش سے کام لیا اور آپ کی تائید بھی اسے حاصل رہی۔ تو چار پانچ سال کے اندر اندر پاکستان میں اُردو کی سرکاری حیثیت مکمل ہو جائے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انگریزی کو ملک سے نکا دیا جائے گا۔ میں سید صاحب سے متفق ہوں کہ انگریزی کا مضمون باقی رکھا جائے گا۔ اور ہم اس کے ادب سے استفادہ کرتے رہیں گے۔ مگر ہم اس غیر ملکی زبان کو اپنی ملکی زبان پر حاوی نہیں دیکھنا چاہتے۔ جو لوگ انگریزی میں خاص مہارت پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ خوشی سے اپنا شوق پورا فرمائیں۔

بعض اوقات، اخبارات میں انگریزی کے بعض بہی خواہ یہ تاثر دیتے ہیں کہ ـــــ انگریزی کو پاکستان سے نکالا جا رہا ہے، حالانکہ ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ یہ مفروضہ محض اوہام یا غلط فہمی پر مبنی ہو سکتا ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اُردو میں علوم کی کتابیں نہیں، پہلے تو یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ کتابیں موجود نہیں۔ میری معلومات کے مطابق تعلیم کے مقاصد کی ابتداء کرنے کے لئے کتابیں موجود ہیں۔ آج ہی نہیں ۱۸۲۶ء میں بھی دلی کالج میں سائنس، ریاضیات کی کتابیں تھیں اور پڑھائی جاتی تھیں۔ اور پھر قبل از تقسیم ہند و پاک حیدر آباد دکن میں تو دفتری و عدالتی نظام سب کا سب اردو میں ہی چلتا تھا۔

پھر میرے یہ دوست غور نہیں فرماتے کہ دُنیا میں طلب و رسد کا قانون جاری ہے۔ کتابوں کا موجود ہونا کتابوں کی ضرورت (طلب) پر موقوف ہے۔ جب تک تعلیم اور عام زندگی میں، ان کی ضرورت یا طلب پیدا نہیں ہوتی ان کی رسد یعنی ان کی موجودگی کس طرح ہو سکتی ہے۔ انگریزی زبان میں بھی پہلے پہلے سائنس اور ریاضی کی کتابیں نہ تھیں۔ پھر جب تعلیم انگریزی میں شروع ہوئی تو دھڑا دھڑ کتابیں اس زبان میں لکھی جانے لگیں۔ لہٰذا آپ کے یہاں کتابیں تب ہوں گی جب استادوں کو اُردو میں پڑھنے پڑھانے اور لکھنے کی مجبوری ہو گی۔

تعجب تو یہ ہے کہ انڈونیشیا اور چین سے لے کر فن لینڈ اور افریقی عرب ممالک تک سب لوگ اپنی زبانوں میں پڑھتے ہیں اور اپنا دفتری کام اپنی ہی زبانوں میں کرتے ہیں مگر وہاں انگریزی کے سورج گرہن کا کسی کو خیال تک نہیں آیا۔

یہ ہمارے ہاں ایک خاص با اقتدار طبقے کی نفسیاتی بیماری ہے۔ ہمارے لوگ چین کی باقی سب خوبیاں تو بیان کرتے ہیں مگر اس امر کا اخفا کرتے ہیں کہ باوجودیکہ چینی لوگ دُنیا کی سب زبانوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن تعلیم اور کاروباری زندگی میں وہ صرف چینی زبان سے ہی کام لیتے ہیں۔

بہر حال انگریزی کے مداحوں سے میں بصد ادب گزارش کروں گا کہ وہ خائف نہ ہوں، انگریزی کو کوئی بھی نہیں نکالتا۔ ہو گا تو فقط یہ کہ قومی زبان کو اپنا حق دیا جائے گا۔ اور انگریزی سے استفادے کی حد مقرر کر دی جائے گی۔ ..... اور وہ بھی معقول تدریج کے ساتھ

لیکن اگر کسی کے دل میں یہ فتور ہے کہ حیلے بہانے کر کے اُردو کو اس کا حق دیا ہی نہ جائے تو میں اس شخص کا ہم خیال کبھی نہیں ہو سکتا کیونکہ قائداعظم کا فرمان ہے:

"پاکستان کی سرکاری زبان اُردو اور صرف اُردو ہو گی۔"

آخر میں ایک بار پھر میں حاضرین کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے میری گزارشات کو توجہ سے سُنا اور جناب حافظ حکیم محمد سعید صاحب مشیر طب صدر پاکستان کا بے حد ممنون ہوں کہ اُنہوں نے آج کی اس محفل شام ہمدرد میں مجھے جناب ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کے پیغام جانفزا کا ہمنوا بننے کا موقع فراہم فرمایا۔

قومی زبان زندہ باد، پاکستان پائندہ باد

علامہ اقبال کی شخصیت اور فن پر لکھی جانے والی پہلی کتاب

اقبال

مصنفہ : احمد دین (مصنف "سرگزشت الفاظ")

مرتبہ : مشفق خواجہ

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۳ء میں طبع ہوئی تھی اور اس ایڈیشن کے تمام نسخے جلا دیئے گئے تھے۔ دوسری مرتبہ یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں ترمیموں اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ نئے ایڈیشن میں متن ۱۹۲۶ء کے ایڈیشن پر مبنی ہے اور ۱۹۲۳ء کے ایڈیشن کے تمام حذف شدہ مباحث اور اختلافات کو کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

کتاب کے شروع میں مرتب نے طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں احمد دین کے حالات زندگی، ادبی کاموں اور علامہ اقبال سے ان کے تعلقات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

صفحات : ۵۲۸

قیمت : چالیس روپے

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

انگریزی اردو جائزہ کانفرنس کے مقاصد

٭از ڈاکٹر سید عبداللہ

جناب صدر، خواتین و حضرات

مجھے اجازت دیجئے کہ میں سب سے پہلے صدر اجلاس جسٹس شمیم حسین قادری صاحب کا شکریہ ادا کروں کہ انہوں نے ہماری دعوت کو شرف قبول بخشا۔ لیکن ہماری شکرگزاری کی یہی ایک وجہ نہیں، ہماری سرگرمیوں کی سرپرستی تو ان کا وہ دوامی انعام ہے جو ہمیں ہمیشہ ملتا رہتا ہے۔ خصوصی سپاس گزاری کا ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ وہ اس ملک کے پہلے جج ہیں جنہوں نے قیام پاکستان کے بعد (شاید اس سے پہلے پر بھی اطلاق ہو سکتا ہو) عدالت عالیہ کے جج کے طور پر اپنا فیصلہ اُردو میں لکھا۔ یوں تو پاکستان کے سارے ججوں پر ہمیں ناز ہے (بشمول چیف جسٹس شیخ انوار الحق) جو قومی زبان کے موید حامی اور بہی خواہ و مدعی ہیں مگر اُردو میں فیصلہ لکھنے کا شرف اول مرتبہ جسٹس شمیم حسین قادری ہی کو حاصل ہوا ہے

آفریں باد بریں ہمت مردانۂ تو

میں اس موقعہ پر ہمدرد ملت جناب حکیم محمد سعید صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا۔ جل تھل بھرپور لبالب۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ وہی اس اجلاس کے داعی بھی ہیں۔ اور میں ان کا ایک عاجز نمائندہ ہوں۔ اس لئے میری سپاس گزاری، سپاس خود بزبان خود کے زمرے میں آجانے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے جزاہ اللہ خیر کہہ کر مندوبین و حاضرین مجلس کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی قربانی بے مثال عام رسم زمانہ کے برعکس وہ ہم پر ایک پیسے کا بوجھ ڈالے بغیر بعید مسافتیں طے کر کے محض اُردو کے لئے تب و تاب جاودانہ کا جذبہ لے کر والہانہ یہاں پہنچے ہیں۔ میں اکیلا ان کا شکریہ کیا ادا کروں گا۔ پوری قوم ان کی شکر گزار ہے۔

خواتین و حضرات۔ اب قدرتی طور سے، یہ سوال سب کے دلوں میں ہوگا۔ کہ اس کانفرنس کے جس کا نام انگریزی اردو جائزہ کانفرنس رکھا گیا ہے۔ مقاصد کیا ہیں اور اگرچہ نام سے کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جاتا ہے تاہم یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اردو کے جائزے کے ساتھ انگریزی کے جائزے کا پیوند کیوں لگایا گیا ہے۔؟

آپ میں سے بہت سے حضرات انگریزی اُردو جائزہ کانفرنس کی ترکیب اسمی کے متعلق شک میں ہوں گے اور انگریزی اُردو کے پیوند اور اس کے جائزے کے بارے میں وضاحت چاہتے ہوں گے۔ توجیہ اس کی یہ ہے کہ ہم اس کانفرنس میں اُردو کے علاوہ انگریزی پر بھی بات کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اس پلیٹ فارم سے یہ کھلا اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ ہم انگریزی پڑھنے کے مخالف نہیں۔ لوگ انگریزی پڑھیں اور خوب پڑھیں مگر علوم اُردو میں پڑھائے جائیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے موجودہ صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے عالمی

٭ یہ خطبہ افتتاحی اجلاس ... (شام ہمدرد) میں پڑھا گیا۔

بین الاقوامی مجالس میں اور عام گفتگو میں اُردو کو اپنا کر نیز ایک با اختیار قومی زبان اتھارٹی قائم کر کے آئین ۱۹۷۳ء کے کچھ خلا دور کر کے اُردو کو اس کا صحیح مقام دلانے کے لیے عملی اور قطعی نہ سہی ایک قدم ضرور اٹھایا ہے۔ اور جب سے یہ ہوا ہے ہمارے ملک کے انگریزوں میں سخت اضطراب پیدا ہو گیا ہے اور وہ کھُلی اور چھپی انتقامی کارروائیوں پر اُتر آئے ہیں اور اُردو کی ترقی کے خوف سے انگریزی کو بلطائف الحیل زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنے کی کوششوں میں لگ گئے ہیں۔ یہاں تک کہ حکام بالا کے احکام کی پروا نہ کرتے ہوئے احکام پر عمل نہیں ہونے دیتے۔ اور اس کے برعکس اپنے ہی حکم سے تعلیم اور دوسرے شعبوں میں انگریزی کا رسوخ بڑھا رہے ہیں۔

موجودہ کانفرنس کا مقصد فقط یہ ہے کہ پبلک اس ردعمل سے آگاہ ہو جائے کہ حکام بالا کے اعلانات اُردو کے حق میں نکل رہے ہیں اور ماتحت حکام کا عمل اور کوششیں انگریزی کے حق میں صرف ہو رہی ہیں۔ ع

زباں کچھ اور بولے پیرہن کچھ اور کہتی ہے

سب سے پہلے یہ ملاحظہ فرمایئے کہ صدر مملکت نے اردو تقریروں کی رسم قائم کی ہے اور وہ اس کی پیروی کی تلقین بھی جابجا کرتے ہیں۔ مگر حکومت کے دوسرے اعضاء وزراء و سکریٹری، بلند مقام عہدے دار صدر کی پیروی کو اپنے لئے ضروری خیال نہیں کر رہے۔

دوسری اہم مثال یہ ہے کہ پنجاب کے عالی مقام گورنر لیفٹیننٹ جنرل محمد سوار خاں نے ایک واضح حکم نامہ نمبر ڈی اے (ایس اینڈ جی اے ڈی) اردو ۵/۷۹ مورخہ ۲ر جولائی ۱۹۷۹ء کے ذریعے نہایت قطعی الفاظ میں پنجاب بھر کے سرکاری نیم سرکاری دفتروں کے سربراہوں کے نام ہدایات جاری کی تھیں کہ اُردو کا فوری استعمال شروع کر دیا جائے۔ اس حکم نامے میں طریق کار، مشکلات کا حل اور ٹائپ مشینوں کے سلسلے میں بڑے صائب مشورے موجود ہیں اور میرا خیال تو یہ ہے کہ اُردو دفتری زبان کے سلسلے میں آج تک اتنی عمدہ اور قابل ستائش و مبارکباد دستاویز نہ لکھی گئی ہوگی۔ مگر راقم الحروف کی معلومات کے مطابق اس حکم نامے پر کوئی عمل نہیں ہوا بلکہ یہ معلوم ہوا ہے کہ بعض بڑے حاکم تو اسے دفتر بے معنی قرار دے کر اس پر نظر بھی نہیں ڈالتے اور صرف انگریزی کا ورد کر کے اپنی عاقبت سنوار رہے ہیں۔

پنجاب میں ایک مجلس زبان دفتری سردار عبدالرب نشتر کے زمانہ گورنری (۱۹۵۰ء) میں قائم ہوئی تھی جسے موجودہ حکومت نے بھی ایک نئی کمیٹی بنا کر قائم رکھا ہوا ہے۔ لیکن دو سال سے اس کمیٹی کا ایک بھی اجلاس نہیں بلایا گیا۔ ایک مختصر اور بے دست و پا مجلس استناد قائم کی ہوئی ہے مگر اس مجلس کے کام کی جہت اور منزل کا کچھ پتہ نہیں، کیونکہ اصل مجلس زبان دفتری کا کوئی اجلاس نہیں ہوا جو مقاصد اور محل استعمال کی تعیین کرتا۔ ہماری وزارت تعلیم نے ۲۸ دسمبر ۱۹۷۹ء کو ببانگ دہل (زیر ہدایت وفاقی کابینہ) اعلان کیا تھا کہ اب ملک میں کوئی نیا انگلش میڈیم سکول نہ کھولا جائے گا۔ لیکن ہر کوئی جانتا ہے کہ نئے انگلش سکول گلی گلی کوچے کوچے میں کھل رہے ہیں اور وزارت تعلیم ہماری معلومات کے مطابق کوئی نوٹس نہیں لیتی۔ بلکہ تعلیم کے اعلیٰ ترین حکام ان مدرسوں میں پہنچ کر انگریزی کے حق میں قصیدے پڑھ کر ثواب کماتے رہتے ہیں اور دعا ہوتی ہے۔ ربنا اعطنا فی الدنیا انگلش وفی الآخرۃ واحفظنا عذاب الاردو۔

مرحوم صدر محمد ایوب خاں کے زمانے میں اردو کو گیارھویں بارھویں جماعت تک لازمی درجہ اوّل مضمون قرار دیا گیا تھا۔ مگر اب وزارت تعلیم کے نصاب سازوں نے از خود ہی اسے درجہ دوم کا مضمون بنا دیا ہے۔ (اس دستاویز کی ایک نقل میرے پاس موجود ہے) حال ہی میں قائد اعظم یونیورسٹی میں شریعت فیکلٹی کا اجرا ہوا ہے آپ یہ سن کر متعجب ہوں گے کہ اس میں قرآن حدیث اور فقہ کی

تعلیم انگریزی میں ہوتی ہے۔ اگر چند سال تک یہی حال رہا تو دینی اصطلاحات ختم ہو کر کلیسائی انگریزی اصطلاحیں زبانوں پر چڑھ جائیں گی۔ اور لوگ شاید صوم و صلوٰۃ جیسے الفاظ سے بھی ناواقف ہو جائیں۔

ہمارے ایک ماہر تعلیم نے جن کا رتبہ وزیر کے برابر ہے حال ہی میں فرمایا کہ جو شخص آپ سے یہ کہے کہ مضامین کو انگریزی میں نہ پڑھو (یعنی اردو میں پڑھو) وہ احمق ہے۔ (بحوالہ نوائے وقت ۲۷ جنوری ۱۹۸۰ء)۔

ہمارے بعض انگریزی پرست دوست اکثر فرماتے رہتے ہیں کہ تعلیم کی عمارت میں انگریزی کی کھڑکی ضرور رکھنی چاہیئے تاکہ اس کے ذریعے مغربی افکار ہمیں ملتے رہیں۔ میں ان سے اتفاق کرتا ہوں۔ اسی لئے تو انگریزی کے مضمون کا حامی ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ جب ہمارے سارے نظام تعلیم کی عمارت انگلش ائرکنڈیشن ہے تو پھر کھڑکی کا استعارہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ اس عمارت کی کھڑکی تو کیا سارے کے سارے دروازے، در و دیوار انگلستان کی ہوا سے ہی تکیف ہیں تو کھڑکی چہ معنی دارد۔ بلاشبہ جب ہم اپنی تعلیم کو دنیا کی باقی اقوام کے مانند ملکی زبان سے تکیف کریں گے۔ تو ان صاحبوں کی تجویز کردہ کھڑکی کے لئے ضرور گنجائش رکھیں گے۔ جس طرح مثلاً چین یا دوسرے غیر انگریزی ملکوں میں ہے۔ لیکن جب تک سب کچھ انگلشن زدہ ہے کھڑکی کا استعارہ لغو ہے۔

تین ماہ قبل شاید پولیس کے افسروں کے رویئے سے متاثر ہو کر ٹریفک کے سپاہیوں کی انگریزی غیرت جوش میں آئی تو انہوں نے شہر لاہور کی اردو تختی کا ڑیوں کے جو شاید آٹھ دس سے زیادہ نہ ہوں گی، چالان کرنے شروع کر دیئے۔ اس پر ڈاکٹر اختر علی بانی ادارہ قومی تشخص نے حکام اعلیٰ کے پاس اپیل کی تب موٹروں پر اُردو کی جاں بخشی ہوئی۔ لیکن ڈاکٹر اختر علی خوش نہ ہوں اب پھر حکم آگیا ہے کہ اردو عربی ہندسوں والی گاڑی کا چالان کیا جائے۔ گویا اب کویت، دوبئی اور عراق کی گاڑیوں کا بھی چالان ہوگا۔ خیر چھوڑیئے یہ تو ٹریفک والوں کی غیرت ایمانی کا معاملہ ہے۔ مگر عوام کے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس شہر میں گاڑیوں کی تعداد ہزاروں سے کم نہ ہوگی مگر ان میں سے کتنی موٹروں پر اُردو کی تختی لگی ہوئی ہے۔ آپ ان ہزاروں انگریزی تختیوں والوں سے کیوں نہیں کہتے کہ اپنی تختیاں اُردو میں لکھوا کر قائد اعظم کے ارشاد کی لاج رکھیں۔ ظاہر ہے سوال سخت ہے اور ہم سب شرمندہ ہیں۔ خاصے عرصے تک لاہور ریونیس کارپوریشن اور ایل ڈی اے میں اردو استعمال ہوتی رہی ہے۔ لیکن اب وہاں بھی انگریزی کا رواج ہو چلا ہے۔

ابھی ۹۔۱۹۷۰ء میں پاکستان ریلوے نے عوام کے آرام کے لئے شالیمار کے نام سے لاہور تا کراچی گاڑی چلائی ہے۔ اس پر مسافروں کے لئے جملہ ہدایات انگریزی میں ہیں۔ حالانکہ انگریزوں کے زمانہ میں بھی ہدایات اُردو میں ہوا کرتی تھیں۔

راولپنڈی کے ایک زنانہ کالج میں اُردو کے تقریری مقابلے کے لئے اشتہار انگریزی میں چھاپا گیا۔ (منسلک لیکن ہم نے احتیاطاً نام حذف کر دیئے ہیں۔) اس پر لڑکیوں نے سخت احتجاج کیا۔

ہماری عدالتوں میں چیف جسٹس شیخ انوار الحق، چیف جسٹس سردار محمد اقبال نے اُردو جلا دی اور ہمارے اجلاس کے صدر جسٹس شمیم حسین قادری نے تو فیصلے بھی اُردو میں لکھے اور ایک سینئر وکیل چودھری نذیر احمد خاں نے اردو میں بحث بھی کی لیکن گونج پیدا نہ ہوئی۔ اور وکلاء پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ وہ پہلے مؤکلوں کو برابر انگریزی لکھا رہے ہیں۔ اور بعض تو اُردو عرضی نویسوں کی روزی مار رہے ہیں۔

اب یہ بھی سن لیجئے کہ حکومت کے خرچ سے کالجوں کے علاوہ باہر بھی فروغ انگریزی کے باقاعدہ ادارے کھل رہے ہیں۔

حضرات جب عشقِ لیلےٰ اس حد تک ہے کہ پاکستان کے انگریز صدر مملکت اور گورنر صاحب کے احکام کی کھلی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ اور کوئی نہیں پوچھتا تو میرے خیال میں دو عملی کو ختم کر کے، انگشت شہادت صاف صاف انگریزی اور صرف انگریزی کے حق میں اُٹھ جائے تو بہتر ہوگا۔ یعنی منافقت کو ترک کر کے صرف انگریزی کو قومی زبان بنا دینے کا اعلان کر دیا جائے تاکہ جس کھڑکی کا نام لے کر، پاکستانی انگریز اُردو کے غبار کو اڑا دینا چاہتے ہیں وہ بھی سلامت رہے اور ساتھ ہی انگریزی کلچر کا وہ بڑا دروازہ بھی مزید کشادہ اور مستحکم ہو جائے جس کے بغیر ہم غیر مہذب اور غیر ترقی یافتہ سمجھے جاتے ہیں۔

قومی زبان اتھارٹی کے لئے ہم صدر مملکت کے ممنون ہیں لیکن یہ اتھارٹی میری رائے ناقص میں ناتمام اور غیر مؤثر ہے اس لئے کہ اصل کام تو یہ تھا کہ قومی زبان کے عملی استعمال کے (تدریجاً ہی سہی) احکام صادر کر دیئے جاتے۔ لیکن موجودہ صورت میں اتھارٹی صرف ایک اشاعتی ادارہ بن کر رہ جائے گی۔ اور اگر اس کی کچھ جاندار سفارشات ہوئیں بھی تو دفتر شاہی انہیں کہاں چلنے دے گی۔ کیا پنجاب میں گورنر صاحب کا حکم نامہ چلا، نہیں چلا۔ کتابیں چھاپنا بھی اچھا کام ہے مگر وہ تو ناشر حضرات بھی کر لیتے ہیں۔ اصل کام تو یہ ہے کہ دفتر تعلیم اور عدالت وغیرہ میں اُردو کے استعمال کے احکام صادر کئے جائیں اور ان پر عمل بھی کرایا جائے۔ ورنہ بدگمانی کی جا سکتی ہے کہ یہ سب کچھ انگریزی کو مستحکم کرنے کے لئے مزید فرصت و مہلت پیدا کرنے کی ایک صورت ہے۔

میں نے اس خطبے میں اس بات کو نہیں چھیڑا کہ اُردو میں صلاحیت ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ عرصہ ہوا ہو چکا ہے۔ اتنا پرانا کہ ۱۸۶۶ء میں ایک کمشنر نے اپنے ایک نوٹ میں لکھا کہ اردو مغرب کی ترقی یافتہ زبانوں کی طرح ہر علمی مطلب و مقصد کے لئے کافی ہے۔ یہی زبان ٹامسن نے لکھا تھا۔ (بحوالہ انگریزی کتاب "اُردو دفتری زبان کا ارتقا" مصنفہ نذیر احمد چودھری صاحب ڈائریکٹر شعبہ دستاویزات قدیمہ حکومت پنجاب) غرض اُردو ہر طرح تیار ہے۔

خواتین و حضرات۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر اُردو کو کچھ دینا ہے تو حکومت اس کے استعمال کا آغاز فوراً کر دے۔ صدر مملکت نے جو اچھی رسمیں قائم کی ہیں اور گورنر صاحب پنجاب نے جو حکم نافذ کیا ہے اس پر فوری استعمال کے آغاز اور تدریجی نفاذ کا حکم صادر ہونا چاہیئے۔ کیونکہ آئین میں ۱۹۸۸ء تک انگریزی کو باقی رکھنے کی جو شق ہے وہ بالکل بے ضرورت ہے اور اس کی جگہ فوری یا دو یا تین سال کی مدت کے الفاظ درج کئے جائیں۔ ع

گر یہ نہیں تو بابا سب کچھ کہانیاں ہیں

دسویں صدی ہجری کی ادبی روایات کا سُراغ

دیوان حسن شوقی

مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی قیمت: پانچ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

قرار دادیں

نعیم صدیقی

قرارداد نمبر ۱

انگریزی اردو جائزہ کانفرنس کا یہ اجلاس سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں وفات پانے والے جملہ اہل علم و ادب و فن کے انتقال پر اظہار تعزیت کرتا ہے اور ان سب کی وفات کو قومی نقصان قرار دیتے ہوئے گہرے رنج و غم کا اظہار کرکے، ان کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے۔

قرارداد نمبر ۲

(الف) پاکستان بھر کی اردو انجمنوں کے نمائندوں کا یہ اجلاس صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی مجالس عامہ میں اردو تقریروں اور تحریروں کو عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اس اقدام کی خصوصی تحسین کرتا ہے اس پر انھیں مبارک باد پیش کرتا ہے کہ انھوں نے قومی زبان اتھارٹی (مقتدرہ) قائم کرکے آئین ۱۹۷۳ء کی لسانی شق کے ایک ایسے خلا کو پُر کر دیا ہے جس کے باعث، قومی زبان کے فروغ کے لیے اب تک عملاً کوئی اقدام نہ ہو سکا تھا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مذکورہ آئین میں، جہاں یہ مذکور تھا کہ انگریزی مزید پندرہ سال کے لیے (یعنی ۱۹۸۸ء تک) سرکاری دفتری زبان رہے گی اور اس عرصے میں قومی زبان کو سرکاری دفتری زبان بنانے کے لیے تیاری کی جائے گی۔ لیکن اس وعدے کے باوجود، آئین میں تیاری کے انتظامات کے لیے کسی ادارے اور اس کے طریق کار کا ذکر نہ تھا جس کی وجہ سے سات سال گزرنے کے باوجود قومی زبان کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ مگر حال ہی میں صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے قومی زبان اتھارٹی قائم کرکے اس کمی کو دور کر دیا ہے چنانچہ اب یہ ادارہ کراچی میں قائم ہو کر سرگرم عمل ہو چکا ہے۔

یہ اجلاس اس اقدام پر مسرت و اطمینان کا اظہار کرتا ہے۔

(ب) اس کے ساتھ ہی آئین ۱۹۷۳ء کی لسانی شقوں کے بعض دوسرے حصوں کی طرف صدر مملکت کو متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہے جن کی وجہ سے مذکورہ بالا اقدام یعنی اتھارٹی کا قیام ناتمام اور غیر موثر ثابت ہو سکتا ہے۔ مثلاً اتھارٹی کی بنیادی دستاویز

میں دفتروں میں قومی زبان کے استعمال کے آغاز کی تاریخ کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ اس اجلاس کی رائے میں دفتروں اور اداروں میں قومی زبان کے فوری استعمال کا قطعی حکم دستاویز میں شامل ہونا ضروری تھا۔ اس اجلاس کی رائے میں تاریخ بھی مقرر کردی جاتی تو اقدام کے موثر ہونے کا یقین ہو جاتا۔

نیز یہ اجلاس تبدیلی کے عمل کی تکمیل کے سلسلے میں ۱۹۸۸ء تک انتظار کو غیر منصفانہ اور بے ضرورت سمجھتا ہے کیونکہ اردو جملہ دفتری، قانونی، انتظامی اور کاروباری معاملات میں اظہار کے لیے بالکل تیار ہے۔ لہٰذا اس اجلاس کی رائے میں اس مدت کو قومی زبان اتھارٹی کے مشورے سے کم کردیا جائے، لیکن ایک سطح تک دفتروں میں قومی زبان کا استعمال فوراً شروع کردیا جائے۔ اگر صدر مملکت اس مشورے کو قبول فرمائیں تو قوم ان کی ممنون ہوگی۔ اس اجلاس کی رائے میں، عبوری عمل کے لیے دو یا تین سال کافی ہیں۔

قرارداد نمبر ۳

پاکستان کی اردو انجمنوں کے نمائندوں کا یہ اجلاس، لیفٹیننٹ جنرل محمد سوار خان گورنر پنجاب کی خدمت میں ہدیۂ تحسین پیش کرتا ہے کہ انھوں نے اپنے حکم نامہ نمبر ڈی۔ اے (ایس اینڈ جی اے ڈی) اردو ۱۶۱/۷۹/۵ مورخہ ۹ جولائی ۱۹۷۹ء کے ذریعے پنجاب بھر کے جملہ سرکاری و نیم سرکاری دفاتر اور اداروں کے سربراہوں کو ہدایت جاری کی تھی کہ وہ اپنے دفتروں میں قومی زبان کا استعمال فوری طور سے شروع کردیں۔ اور اس کے لیے ایک عملی دستور العمل بھی پیش کردیا تھا۔

اس جرأت مندانہ اور قطعی اعلان پر جناب جنرل صاحب کی یہ دستاویز، برصغیر کی دفتری زبان اردو کے ارتقا کے سلسلے میں نہایت قیمتی، موثر اور قطعی ہدایت نامے کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن یہ اجلاس بصد افسوس گورنر صاحب کو اس امر کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے کہ عام معلومات کے مطابق ابھی تک لاہور کے سول سیکرٹریٹ سمیت، لاہور اور باقی کسی شہر میں، ان کے حکم اور ان کے دستور العمل پر عمل شروع نہیں ہوا جس کے اسباب کی تحقیق لازمی معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ اداروں کے سربراہ جناب گورنر صاحب کی رائے سے متفق نہیں لہٰذا تعمیل کا ارادہ نہیں رکھتے۔

یہ اجلاس جناب گورنر صاحب سے یہ درخواست بھی کرتا ہے کہ وہ ان اداروں (مثلاً" لاہور میونسپل کارپوریشن، ایل ڈی اے۔ واسا، واپڈا، ریلوے وغیرہ) کے نام جن میں انگریزوں کے زمانے میں اردو رائج تھی ایک حکم نامہ جاری کرکے استفسار فرمائیں کہ مذکورہ اداروں نے اپنے دفتروں میں اردو کا استعمال کیوں ترک کردیا ہے اور مزید ہدایت یہ بھی جاری کریں کہ وہ حسب سابق اپنے دفتروں میں اردو میں خط وکتابت کیا کریں۔

قرارداد نمبر ۴

نئے انگلش میڈیم اسکول احکام بندش کے باوجود کیوں کھل رہے ہیں؟

یہ کانفرنس اس امر کو سخت تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہے کہ ۱۹۷۹ء میں وفاقی حکومت نے واضح اعلان کیا تھا کہ آئندہ ملک میں کوئی نیا انگریزی ذریعہ تعلیم اسکول کھولنے کی اجازت نہ دی جائے گی اور موجودہ اسکولوں میں بھی پہلی جماعت سے اردو

ذریعہ تعلیم کا آغاز ہو جائے گا۔ لیکن یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ ملک بھر میں نئے انگریزی ذریعہ تعلیم اسکول ہر ہر محلے میں کھل رہے ہیں مگر حکومت کی طرف سے ان پر کوئی بندش نہیں۔

یہ اجلاس وفاقی وزارت تعلیم کو اس کھلی خلاف ورزی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے التماس کرتا ہے کہ اس سلسلے میں سخت امتناعی احکام جاری کیے جائیں۔

قرارداد نمبر ۵

یہ کانفرنس قومی زبان مقتدرہ سے مطالبہ کرتی ہے کہ اس ادارے کو جلد از جلد موثر اور فعال بنا کر یہ ثابت کر دیا جائے کہ اردو کا مطالبہ کرنے والے، اپنے عزائم و مقاصد میں مخلص، پُرجوش اور سرگرم ہیں۔

کانفرنس کی درخواست ہے کہ مقتدرہ کو محض اشاعتی ادارہ بنانے کے بجائے مستحکم تحریکی و تنظیمی ادارہ بنانے کی کوشش کی جائے، سرگرمیوں کا عملی تحریکی پروگرام بنائے، سیمینار منعقد کرائے، عوام کے افہام کے لیے رابطہ مہم جاری کرے اور حکام پر اس طرح دباؤ ڈالے کہ انہیں عملی عمل درآمد پر مجبور ہونا پڑے۔

قرارداد نمبر ۶

کانفرنس کا یہ اجلاس پولیس حکام کے اس حکم کی سخت مذمت کرتا ہے کہ گاڑیوں پر اردو/عربی ہندسے نہ لکھے جائیں۔ ..... حالانکہ تمام عرب اور اسلامی ممالک میں عربی ہندسے لکھے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان میں ہندی اور بنگلہ دیش میں بنگلہ ہندسے لکھنے کی کوئی ممانعت نہیں۔

ظاہر ہے کہ پولیس احکام کے تازہ حکم کا اثر عرب ممالک کی گاڑیوں پر بھی پڑے گا کیونکہ وہ لوگ اپنے گاڑیوں پر عربی (اردو) ہندسے لکھتے ہیں۔ لہٰذا مطالبہ ہے کہ یہ حکم واپس لیا جائے ورنہ پبلک کی طرف سے اس حکم کی مزاحمت کا اندیشہ ہے۔

قرارداد نمبر ۷

یہ کانفرنس اس امر کی مذمت کرتی ہے کہ قائداعظم یونیورسٹی میں شریعت فیکلٹی کے مضامین علوم اسلامیہ، قرآن حدیث اور فقہ وغیرہ کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اور مطالبہ کرتی ہے کہ فوری طور سے شریعت فیکلٹی میں اُردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔

قرارداد ۸

یہ کانفرنس اس امر کی مذمت کرتی ہے کہ عام کالجوں کے علاوہ، عام دائرے میں بھی، حکومت کے خرچ سے فروغ انگریزی کے ادارے کھولے جا رہے ہیں۔ کانفرنس اس بات پر حیرت زدہ ہے کہ انگریزی کی اشاعت کے معاملے میں پاکستان کے انگریز امریکہ و برطانیہ کے کارندوں کا کردار ادا کر رہے ہیں، یہ امر تعلیمی نقطۂ نظر کے علاوہ تہذیبی لحاظ سے بھی سخت شرمناک ہے کہ عربی، فارسی، ترکی

اور اردو کی توسیع و اشاعت کے لیے سرگرم ہونے کے بجائے، اسلامی اقدار کا دعویدار ملک پاکستان ایک غیر ملکی اجنبی زبان کو (جو دورِ استعمار کی یادگار ہے) پھیلانے کے لیے اتنے جوش و خروش کا اظہار کرے۔

قرارداد نمبر ۹

مجلس زبان دفتری کے متعلق مطالبہ

یہ کانفرنس مطالبہ کرتی ہے کہ حکومت پنجاب نے جو مجلس زبان دفتری قائم کر رکھی ہے اس کو صحیح معنوں میں ایک توانا اور سرگرم ادارہ بنانے کے لیے اسے قومی زبان مقتدرہ کا ایک شعبہ بنا کر اس کے لیے باقاعدہ کل وقتی سیکرٹری اور دیگر معیاری عملہ مقرر کر کے دفتری زبان کی تہذیب و تدوین کو سنجیدگی کے ساتھ شروع کیا جائے۔ اسی طرح اس مجلس کے موجودہ عملے کے شرائط کار اور حقوق ملازمت کو بہتر بنایا جائے۔ نیز عملہ معیاری اور مکمل ہو اور اس کی تنخواہ کے اسکیل منصفانہ اور جاذب ہوں۔ اس کے علاوہ سارے عملے کو سیکرٹریٹ کے دوسرے شعبوں کے مساوی صحیح اسکیل دیئے جائیں۔ یہ کانفرنس مجلس زبان دفتری کے موجودہ تعطل اور غیر تسلی بخش رفتار پر بے اطمینانی اور تشویش کا اظہار کرتی ہے اور جناب گورنر صاحب کو متوجہ کرتی ہے۔

قرارداد نمبر ۱۰

اردو ہندسوں اور اردو گنتی کو دوبارہ رائج کیا جائے۔

یہ اجلاس وزارت تعلیم پاکستان سے اپیل کرتا ہے کہ بنیادی تعلیم حاصل کرنے والی بچوں کی کتابوں میں انگریزی کے بجائے اردو کے ہندسوں کو رواج دیا جائے اور عام طور سے جملہ تحریروں میں اُردو ہندسوں ہی کو رائج کیا جائے اور انگریزی ذریعۂ تعلیم والے اسکولوں میں بھی بچوں کو اردو ہندسے سکھانے کے علاوہ انھیں اردو گنتی بھی سکھائی جائے کیونکہ موجودہ صورت میں یورپین ٹائپ اسکولوں کے بچے، دیسی گنتی سے بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ امر قومی فضا کے اعتبار سے افسوسناک بھی ہے اور تشویشناک بھی۔ لہٰذا فوری طور سے اُردو ہندسوں اور اردو گنتی کو رائج کیا جائے۔

قرارداد نمبر ۱۱

ازبکہ تعلیم میں خط نسخ کا تجربہ کامیاب نہیں ہوا اور ملک بھر کے اساتذہ اور والدین اس کے حق میں نہیں اس لیے یہ کانفرنس مطالبہ کرتی ہے کہ مثل سابق، تعلیم میں نستعلیق کو رواج دیا جائے اور خط نسخ کو عربی کے لیے اور حسب ضرورت اور صرف ضروری مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے۔

قرارداد نمبر ۱۲

کانفرنس کا یہ اجلاس اپنے اس یقین و ایمان کا اعادہ کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ انگریزی زبان نہ صرف یہ کہ ملک کی قومی زبان نہیں ہو سکتی بلکہ یہ بھی کہ اس کے بے ضرورت استعمال اور اس کے بے مقصد توسیع و اشاعت سے ہماری قومیت اور تہذیب کو گزند پہنچنے کا اندیشہ ہے خصوصاً جب کہ ہمارے پاس اپنی وسیع الاطراف اور با ثروت قومی زبان موجود ہے، انگریزی زبان کا نجی دائرے میں پھیلنا یا اس کا پھیلایا جانا ہماری تعلیم کے لیے خطرے کا باعث ہے بلکہ اس سے خود ہماری قومیت اور ملکی وحدت کو بھی نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ یہ کانفرنس جائز ضرورتوں کے سلسلے میں انگریزی کی تعلیم اور استعمال کی مخالف نہیں لیکن اس کی بالادستی اور غلبے کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ بنا بریں یہ اجلاس جمہور سے درخواست کرتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو:

۱۔ نجی اور کاروباری دائرے میں انگریزی کے استعمال سے احتراز کر کے اور اردو کو رائج کر کے اپنے قومی احساس کا ثبوت دیں۔

۲۔ اپنے مکانوں اور دکانوں کے نام اردو میں لکھوائیں۔

۳۔ کاروباری اشتہارات اور بورڈ اردو میں تیار کرائیں۔

۴۔ عید نامے اور ملاقات نامے، غرض جملہ نجی تحریریں اور رقعات جہاں تک ممکن ہو اردو میں ہوں۔

۵۔ سڑکوں اور نئی آبادیوں کے اردو نام تجویز کر کے ان کو رائج کرائیں۔

۶۔ کاروباری اور نجی امور میں انگریزی زبان ترک کر کے قومی زبان کی ترقی و ترویج کا راستہ ہموار کریں۔

۷۔ اور اس مقصد کے لیے اپنے اپنے شہروں میں اردو کی خاموش تحریک جاری کریں تاکہ انگریزی کے بے جا غلبے کا انسداد ہو سکے۔

۸۔ شاہراہوں پہ اشارے اور اداروں کی تختیاں اردو میں لکھوائی جائیں۔

قرارداد نمبر ۱۳

مختلف مقامات پر اردو کانفرنس کا انعقاد کیا جائے۔ اردو انجمنوں کا یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ اردو کے ارتقاء اور عوامی سطح پر اس قومی زبان کو مقبول بنانے کے لیے، ضلعی صدر مقام پر اردو کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام کیا جائے اور دفتری و عدالتی زبان کی مہم جاری رکھی جائے۔

قرارداد نمبر ۱۴

(اظہار شکریہ ناظم کی طرف سے)

انگریزی اردو جائزہ کانفرنس ۱۹۸۰ء کا ناظم ان تمام حضرات و خواتین کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے اس

کانفرنس کو کامیاب بنانے میں حصّہ لیا۔ اس سلسلے میں گرامی منزلت جج صاحبان و دیگر صاحبان کے صاحبان کے علاوہ حضرات حکیم محمد سعید صاحب صدر ہمدرد فاؤنڈیشن، مندوبین، مقررین اور کارکنان و رضا کاران اور پریسوں کے مالکان کا شکریہ ادا کرتا ہے اور ان سب کی خیر و عافیت کے لیے دست بدعا ہے۔

مندوبین کی تجاویز

۱۔ (الف) تمام کاروباری کمپنیوں، فرمز یا وقف ادارات کی رجسٹریشن کے لیے لازمی شرط یہ ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے آرٹیکلز اور میمورنڈم کو اردو میں ضرور داخل کریں۔ اس کے ساتھ چاہیں تو انگریزی یا کسی اور زبان میں بھی دونوں چیزیں دے سکتے ہیں چاہیں تو انگریزی یا کسی اور زبان میں بھی دونوں چیزیں دے سکتے ہیں چاہیں تو صرف اردو میں۔

(ب) کارخانوں، تجارتی کمپنیوں اور فرمز یا وقف ادارات اور انجمنوں کے لیے اردو میں نام رکھنا ضروری ہو خواہ وہ انگریزی یا کسی اور زبان میں بھی اپنا نام استعمال کریں۔

(ج) تمام کارخانوں، دفتروں، دکانوں، ہوٹلوں کے سائن بورڈوں پر اردو میں نام اور دیگر امور ضرور لکھے جائیں خواہ اس کے ساتھ انگریزی یا کسی دوسری زبان میں بھی اندراج ہو۔

۲۔ پبلک کے استعمال میں آنے والے تمام فارم (خواہ وہ حکومت کے محکموں سے متعلق ہوں یا میونسپل اداروں سے یا میونسپل اداروں سے یا اور کسی بھی نیم سرکاری دفتر سے) اردو میں ہونے چاہیں ضرورت ہو تو زائد اندراجات انگریزی یا کسی دوسری زبان میں بھی ہو سکتے ہیں۔

۳۔ ریلوں، بسوں (ہوائی جہازوں کی اندرون ملک پروازوں کے لیے) ٹکٹ اردو میں چھاپے جائیں، چاہے غیر ملکیوں یا اردو نہ جاننے والوں کے لیے اردو عنوانات کے ساتھ انگریزی میں بھی ترجمہ چھاپ دیا جائے۔ خانہ پُری اُردو میں ہو۔

۴۔ ڈاک خانے کی روزانہ استعمال میں آنے والی مہریں اُردو میں ہونی چاہئیں۔

۵۔ یونیورسٹیوں کے کانووکیشن کی کارروائی اُردو میں ہونی چاہیئے یہ تمام امور ایسے ہیں کہ ان کے لیے حکومت کی طرف سے اجرائے حکم کی ضرورت ہے۔

اردو تحقیق و تنقید میں گراں قدر اضافہ

اُردو کی نثری داستانیں

تحریر: ڈاکٹر گیان چند قیمت: اٹھارہ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ کراچی ۱۰

قومی زبان اُردو کی موجودہ حیثیت

اور

اس کے مطالبات

حمید اللہ خاں ضیاؔ اسلام پوری

پاکستان کی یکجہتی اور اتحاد کے لیے جن امور کی اشد ضرورت ہے۔ ان میں قومی زبان کا مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لئے آغاز ہی میں حضرت قائدِ اعظم نے جہاں یہ اعلان کیا تھا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت ہوگی۔ وہاں یہ بھی واضح طور پر فرما دیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔

گو ابتدا سے آج تک ہر حکومتِ وقت اُردو کی ترقی و ترویج کی مدعی رہی ہے۔ اور اس نے اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ عملی کام بھی کیا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اُردو کی ترقی و پیش رفت کے لئے جتنا کام ہونا چاہیئے تھا۔ اتنا نہیں ہو سکا۔ تینتیس سال کا طویل عرصہ گذر جانے کے باوجود اردو کو اپنے جائز حقوق سے محروم چلی آرہی ہے۔

قیام پاکستان سے قبل اردو زبان بلا اختلاف متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی زبان خیال کی جاتی تھی۔ بنگال سے لے کر بلوچستان اور سوبہ سرحد تک تمام مسلمان اس کے وارث اور سرپرست سمجھے جاتے تھے۔ پنجاب تو دلی۔ لکھنؤ اور حیدر آباد دکن کی طرح اردو زبان کا گھر ہی تھا۔

اس کے برعکس ہندو اردو زبان سے پورا فائدہ اٹھانے کے باوجود اس کے اس لئے مخالف تھے کہ وہ اس کو مسلمانوں کی زبان قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک اردو کا سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ یہ زبان ہندوستان کے مسلم فرمانرواؤں کے عہد میں عالم وجود میں آئی تھی۔ ہندو اسے مسلمانوں کے دورِ اقتدار کی ایک نمایاں علامت خیال کر کے اس کے ساتھ تعصب روا رکھتے تھے۔ اردو میں لکھنے پڑھنے، اردو میں اخبارات و رسائل نکالنے کے باوجود اُن کا رویہ اس زبان کے ساتھ معاندانہ تھا۔

قیام پاکستان کے بعد جس طرح مسلمانوں کو بھارت کی سرزمین سے دیس نکالا ملا تھا۔ اسی طرح وہاں اردو زبان کے لئے بھی زمین تنگ ہو گئی تھی۔ لیکن یہ اردو زبان کی سخت جانی اور پُر سحر حیثیت کا کمال ہے کہ وہ بھارتی حکومت کے ہاتھوں زندہ درگور تو ہو گئی۔ مگر مٹ نہ سکی۔ بلکہ وہاں کے کروڑوں مسلمانوں کے ساتھ حقیقت پسند ہندوؤں کی پسندیدہ علمی و ادبی زبان ہونے کی حیثیت سے آج بھی بھارت کی زندہ زبانوں میں اپنا خاص وزن اور مقام رکھتی ہیں۔

خیال تھا کہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد یہاں اردو زبان کو فروغ حاصل ہو گیا۔ کیونکہ مسلمہ طور پر سارے ملک کے مسلمانوں کی مشترکہ زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور اسی بنا پر حضرت قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ نے واشگاف الفاظ میں فرمایا تھا۔ کہ

"پاکستان کی مشترکہ زبان جو اس کے مختلف صوبوں کے درمیان افہام و تفہیم کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ وہ اردو کے سوا کوئی

زبان نہیں۔ اردو ہی کو ملک کی سرکاری زبان ہونا چاہیئے۔ اسی سلسلہ میں آپ نے اردو کے حق میں کہا کہ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اردو میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا بہترین سرمایہ دوسری زبانوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس لئے میں آپ کو صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو اور صرف اُردو ہوگی۔"

قائدِ اعظم کے علاوہ تقریباً تمام دوسرے قومی رہنماؤں نے بھی اردو کی اہمیت و افادیت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو متفقہ طور پر قومی و سرکاری زبان قرار دے دی گئی۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ قومی رہنماؤں اور حکومتی اداروں کی زبانی کلامی اور کس قدر عملی ہمدردی کے باوجود اردو زبان پاکستان میں آج تک بدیشی زبان انگریزی کی جگہ کسی بھی دفتر یا دربار میں مکمل طور پر اپنا منصب حاصل نہیں کر سکی۔

معلوم ہوا ہے کہ موجودہ مرکزی حکومت نے بھی اردو کو رائج کرنے اور ملک کو غیر ملکی زبان (انگریزی) کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے اکتوبر ۱۹۷۹ء میں ایک نیشنل لنگویج اتھارٹی نامی ادارہ کی تشکیل کا اعلان کیا ہے۔

اس ادارہ کے حسب ذیل مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔ (اور یہ اسی قسم کے مقاصد ہیں۔ جو آغاز پاکستان سے قومی رہنماؤں اور فرمانرواؤں نے بار بار دہرائے ہیں)

۱۔ اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے رائج کرنے کے ذرائع پر غور کرنا اور اس کے لئے انتظامات کرنا۔

۲۔ اردو کو ملک بھر میں دفتری زبان کے طور پر رائج کرنے کے لئے الفاظ اور اصطلاحات تیار کرنا۔

۳۔ اردو کی ترقی کے لئے کام کرنے والے اداروں میں رابطہ پیدا کرنا۔

۴۔ وفاقی و صوبائی سروس کمیشن کے تعاون سے ایسے اقدامات کرنا جن سے اردو مقابلہ کے امتحان کی زبان بن سکے۔

۵۔ قومی زبان کو رائج کرنے کے لئے صدر مملکت کی طرف سے تفویض کردہ ذمہ داریوں کی مکمل اعانت۔

اس ادارہ کی سربراہی کی ذمہ داری کا بوجھ ملک کے ممتاز ماہر تعلیم جناب اشتیاق حسین قریشی کے کندھوں پر ڈالا گیا ہے اور انہوں نے بہ حیثیت چیرمین نیشنل لنگویج اتھارٹی (مقتدرہ اردو) اس عزم کا اظہار کیا ہے۔ کہ ملک کے تمام سرکاری اداروں و نیم سرکاری دفاتر اور تعلیمی اداروں میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کرنے کے لئے تیزی سے اقدامات کئے جائیں گے۔ ساتھ ہی انھوں نے کچھ تجاویز کا مبہم سا خاکہ بھی پیش کیا ہے۔

اسی سلسلہ میں یہ اخباری اطلاع بھی کافی حوصلہ افزا ہے۔ کہ وفاقی حکومت نے نیشنل لنگویج اتھارٹی مقتدرہ اردو کو ابتدائی کام کے لئے دس لاکھ روپے کی خطیر رقم بھی دی ہے۔

وفاقی حکومت کی طرح صوبائی حکومتیں بھی قومی زبان اردو کی نشر و اشاعت کے لئے یقیناً مستعدی سے کام کر رہی ہوں گی۔ دوسری صوبائی حکومتوں کے اس کام کے متعلق کچھ وثوق سے کہنا ذرا مشکل ہے۔ البتہ پنجاب کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ کہ ایک خبر کے مطابق حکومت پنجاب نے اپنی چٹھی نمبری ۱۵۷/۷۹/۵ مورخہ ۹ جولائی ۱۹۷۹ء کی رو سے تمام سرکاری دفاتر میں انگریزی کی جگہ اردو رائج کرنے کی واضح ہدایت کر دی ہے۔ اور اس طرح اس نے اپنا فرض کسی حد تک ادا کر دیا ہے۔ اس ہدایت پر عمل پیرا ہونا متعلقہ اداروں کا کام ہے۔ البتہ یہ دیکھنا کہ کس قدر عمل ہوا ہے حکومت کے فرائض سے باہر نہیں ہو سکتا۔

بہرحال ایک بات جسے سب تسلیم کرتے ہیں اور دہراتے رہتے ہیں۔ بالکل واضح ہے کہ اردو ہماری قومی زبان ہے۔ اور اس کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اسے رائج کر کے غیر ملکی زبان انگریزی کا تسلط ختم کیا جائے کیونکہ غیر ملکی زبان کی حکمرانی سے ہمارے قومی تشخص کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ لوگ اپنی زبان کو حقیر خیال کرتے ہیں۔ اور ان میں احساس کمتری پیدا ہوتا ہے۔

اس برملا احساسِ زیاں کے باوجود ابھی تک حالات کی خرابی کا پوری طرح قلع قمع نہیں ہو سکا۔ انگریزی کا سکہ بدستور ملک کے طول و عرض میں رواں ہے۔ راقم کی حسب ذیل رباعی اس حقیقت کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔

رُباعی

ابھی انگلش پڑھائی جا رہی ہے ابھی آگے بڑھائی جا رہی ہے
غلامی کے زمانے کی نشانی ابھی تک سر چڑھائی جا رہی ہے

دیکھنا یہ ہے کہ اردو کی پیش رفت کیوں خاطر خواہ طور سے نہیں ہو رہی۔ اس کی راہ میں کون روڑے اٹکا رہا ہے۔ اردو کو رائج کرنے اور اسے انگریزی کی جگہ دینے میں کونسی حکمت عملی سدِ راہ بنی ہوئی ہے یا وہ کون سے موانع ہیں۔ جو اردو کی بحیثیت قومی زبان رواج پانے کے عمل کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہو رہے ہیں۔ کیا انگریزی خواں طبقہ اور وہ لوگ جو افسر شاہی کے نام سے معروف ہیں۔ اردو کا راستہ روکے ہوئے ہیں۔ کیا علاقائی بولیوں کے حامی اور صوبائی لسانی تعصب کا زہر پھیلا کر ملک کی وحدت و استحکام کو ضعف پہنچانے کے درپے لوگ اسے شاید مقصود سے ہمکنار نہیں ہونے دیتے یا قومی اقدار کے وہ مخالف جو نشر و اشاعت کے مختلف اداروں میں مسلمہ اثر و رسوخ کے مالک بیان کئے جاتے ہیں۔ اس کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ یا اردو کے حامی و معاون اداروں کی سست روی اور بے عملی کا اثر ہے۔ کہ اردو کو اس کا جائز حق دیئے جانے کا مسئلہ ہنوز معرض التوا میں پڑا ہوا ہے۔

کچھ بھی ہو۔ اس حقیقت سے سرِ مو انحراف کرنے کی گنجائش نہیں۔ کہ اردو زبان تا حال صرف کاغذات میں قومی زبان بننے کا شرف حاصل کر سکی ہے عملی طور پر ابھی اس کو یہ اعزاز پوری طرح حاصل نہیں ہو سکا۔ میں اپنے دعویٰ کی دلیل میں مندرجہ ذیل حقائق پیش کر کے ذمہ دار حضرات کی توجہ اردو کی مکمل حق رسی کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کروں گا۔ یہ حقیقت ہے کہ

۱۔ ابھی تک تمام دفتروں میں انگریزی کا عمل دخل ہے۔ رپورٹیں کارروائیاں۔ بل اطلاع نامے۔ فیصلے وغیرہ انتہا یہ ہے کہ دستخط تک غیر ملکی زبان انگریزی میں جاری و ساری ہیں۔ اردو کو ان تمام امور میں برائے نام حصہ بھی شاید ہی ملتا ہو۔

۲۔ محکمہ ڈاک کے تقریباً تمام کاغذات انگریزی زبان میں چھپتے اور پُر کئے جاتے ہیں۔ ڈاک کے ہر قسم کے فارم حتیٰ کہ منی آرڈر فارم تک تا حال اردو کے قالب میں نہیں ڈھالے گئے۔ اردو میں تار بھیجنے کا سوال تو خارج از بحث نظر آتا ہے۔

۳۔ سڑکوں کے نشانات اور بورڈ وغیرہ انگریزی میں لکھے ہوئے پائے جاتے ہیں۔

۴۔ سرکاری و غیر سرکاری گاڑیوں کے نمبر اور نام کی تختیاں اکثر بدیشی زبان انگریزی میں لکھی جاتی ہیں۔ اسی طرح افسران کے دفاتر اور رہائشی مکانات کی شناختی تختیاں یا بورڈ بھی عموماً انگریزی زبان میں ہوتے ہیں۔

۵۔ ریلوے کے تقریباً تمام کاغذات ابھی تک انگریزی میں چل رہے ہیں۔

۶۔ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کو قومی زبان کے فاضلوں پر وہی فضیلت حاصل ہے۔ جو کسی آقا کو غلام پر ہوتی ہے یا اعلیٰ کو ادنیٰ پر ہوتی ہے۔

۷۔ ملکی کارخانوں میں جو بھی مال تیار ہوتا ہے۔ اس پر جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ اکثر و بیشتر غیر ملکی زبان انگریزی میں ہوتا ہے۔ خاص کر ادویہ تیار کرنے والے کارخانہ دار اپنی مصنوعات کے ناموں کے ساتھ ہدایات بھی انگریزی میں چھاپتے ہیں۔ گویا اس ملک میں انگریز بستے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہدایات عوام کے لئے بیکار محض ہوتی ہیں حیرت کا مقام کہ بیٹری سیل، پنسل، قلم، بال پین، ربڑ اور سیاہی کی بوتل جیسی عام اشیاء پر بھی انگریزی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ حالانکہ یہ سب پاکستانی مصنوعات ہیں۔ اور ان پر قومی زبان میں نام وغیرہ لکھنے کے لئے اصطلاحات وضع کرنے یا الفاظ ڈھونڈنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔

۸۔ محکمہ تعلیم کے تمام دفتری کاغذات بدستور انگریزی میں جاری ہیں چھٹی کے فارم تک انگریزی میں ہیں۔

۹۔ پُلوں، بیراجوں اور زیر تعمیر منصوبوں کے متعلق تعارفی و ہدایاتی بورڈ ہر جگہ انگریزی میں پائے جاتے ہیں۔

۱۰۔ بنکوں کی تمام نوشت خواند انگریزی میں ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ پنشن برآمد کرانے کی درخواست کا فارم بھی انگلش میں رائج ہے۔

۱۱۔ ہسپتالوں میں نیچے سے اوپر تک انگریزی زبان کی عملداری ہے۔ نسخوں کے علاوہ بیماروں کے ٹکٹ، زخمیوں اور مقتولوں کی رپورٹیں انگریزی میں لکھی جاتی ہیں۔

۱۲۔ ٹکٹوں اور سکوں پر غیر ملکی زبان انگریزی کا استعمال قومی زبان اُردو کے مقابلہ میں نمایاں طور پر زیادہ ہے۔

۱۳۔ محکمہ واپڈا کے اکثر و بیشتر فارم اور دیگر کاغذات انگریزی میں ہیں جو شہری اور دیہاتی عوام کے لئے چیستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۴۔ اکثر بڑے لوگ تقریر و تحریر میں اردو کو منہ لگانا باعث ننگ و عار خیال کرتے ہیں۔ خدا بھلا کرے موجودہ صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق کا جنہوں نے قومی زبان اردو میں تقاریر کا آغاز کیا اور ایک نیک اور قابل تقلید مثال قائم کر کے ملک کی بہت اہم ضرورت پوری کر دی ہے۔

۱۵۔ یہ عجیب بات ہے کہ انگریزی میں دستخط کرنے کی عادت عام ہے۔ بڑے سے بڑے افسر سے لے کر ادنیٰ اہلکار تک اس میں برابر کے شریک ہیں۔ ملازموں کے علاوہ شہریوں میں بھی یہ بیماری عام ہے۔ قومی اداروں میں کام کرنے والے بھی عموماً دستخط انگریزی میں کرنا پسند کرتے ہیں۔

کیا دستخطوں کے لئے بھی اصطلاحات کے مرتب ہونے کا انتظار ہے کیا یہ لوگ اتنے نااہل ہیں کہ اردو میں دستخط نہیں کر سکتے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں۔ ان کے ایسا کرنے کا سبب کچھ اور ہے۔ جس کا تعلق رجحان طبع سے وابستہ ہے۔ مرزا غالب کا یہ شعر اُن کی نفسیاتی کیفیت کی پوری طرح عکاسی کرتا ہے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی

انگریزی میں دستخط کرنے والے پاکستانی حضرات قومی زبان کی اہمیت اور حب الوطنی کے تقاضوں سے بے خبر تو نہیں ہو سکتے۔ مگر وہ کیا کریں کہ ان کے انگلش زدہ دل و دماغ انہیں اُردو میں دستخط کرنے پر مائل نہیں ہونے دیتے یا وہ احساس کمتری کے دباؤ سے اتنے زیادہ متاثر ہیں۔ کہ اردو میں دستخط کرنا خفیف الحرکتی خیال کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ وہ ہمارے صاحبان اقتدار و اختیار کو قومی زبان اردو کو ملک بھر میں پوری طرح عملی طور پر رائج کرنے کی توفیق و ہمت عطا کرے اور چیئرمین نیشنل لنگویج اتھارٹی مقتدرہ اردو کے اس عزم کی کشتی کو جلد از جلد ساحل مراد سے ہمکنار کرے۔ جس کی رُو سے وہ قومی اردو کو سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کرنا چاہتے ہیں۔

میں اس تلخ نوائی کے لئے عُرفی شیرازی کا یہ شعر بطور معذرت پیش کر کے رخصت چاہوں گا۔

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کمیابی — حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

خطبہ صدارت سائنٹیفک سوسائٹی پاکستان

ڈاکٹر بشیر الدین محمود
(ناظم شعبہ صنعتی رابطہ جوہری توانائی کمیشن)

حاضرین کرام اور انجینئر صاحبان

السلام علیکم

میرے لئے یہ انتہائی خوشی کا موقعہ ہے کہ آپ نے مجھے سائنٹیفک سوسائٹی پاکستان کی سالانہ کانفرنس کے شعبہ علوم طبیعی کی صدارت کے لئے نامزد کیا۔ ایک انجینئر کے لئے اس شعبہ کی صدارت باعث عزت افزائی ہے۔ اور اس کے لئے میں منتظمین کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس صدارت کے پردہ میں مجھے آپ جیسے قابل اور ذہین لوگوں سے خطاب کا موقع ملا ہے۔

سائنس میں علوم طبیعی کا مقام اس قدر بلند اور عیاں ہے کہ آپ کے سامنے اس کا اعادہ کرنا آپ کے قیمتی وقت کا ضیاع ہوگا۔ بنیادی طور پر یہ تمام تر سائنس، طبیعات کے دائرہ کار میں محدود ہو جاتی ہے۔ قدرت کا کوئی بھی عمل خواہ وہ بظاہر کیمیا، زراعت، حیوانیات وغیرہ سے کیوں نہ تعلق رکھتا ہو۔ درحقیقت جوہری اور تحت جوہری سطح پر علوم طبیعی ہی کے تابع نظر آئے گا۔

عملی میدان میں علوم طبیعی کی حیثیت تمام تر سائنسوں سے زیادہ اہم ہے ان کا احاطہ ابتدائی زراعت اور توانائی کی ساہیت اور تحقیق سے لے کر انجینئری اور فضائیات (ٹکنالوجی) کی تمام تر شاخوں پر حاوی ہے۔ کانفرنس کے شعبہ علوم طبیعی میں ہمارا سروکار بیشتر طبیعات کے ان ہی پہلوؤں سے اور ملک کے ذہین سائنس دان اور انجینئر اپنے اپنے میدان عمل سے بیش قیمت مشاہدات، تجزیے اور تجاویز ہمارے سامنے لائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ بحث و تمحیص کے بعد جو نتائج اخذ ہوں گے وہ ہمارے ملکی سائنس اور انجینئری کے لئے بڑی اہمیت کے حامل ہوں گے۔ لہٰذا میں نے اپنے خطبہ صدارت کے لئے علوم طبیعی میں سے کوئی موضوع نہیں چنا ہے بلکہ ہمارے ملک میں ماہرین علوم طبیعی کی ذمہ داریوں کے متعلق کچھ کہنے کی اجازت مانگوں گا۔

مقصد

خواتین و حضرات ہم سب ایک ترقی پذیر معاشرہ کے افراد ہیں۔ یہ وہ معاشرہ ہے جو اپنی بقا اور اصلاح کے لئے پچھلے

لہ سائنٹیفک سوسائٹی پاکستان کی انیسویں سالانہ کانفرنس میں پڑھا گیا جو قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے زیر اہتمام منعقد ہوئی۔ دیکم ستمبر تا ۵ ستمبر ۱۹۷۹ء

سو سال سے زیادہ عرصے سے طاغوتی طاقتوں سے برسرِ پیکار رہے۔ اس کے سامنے کچھ اعلیٰ مقاصد رہے ہیں۔ جن کا خدوخال قیام پاکستان کے ساتھ اور زیادہ واضح ہو گیا۔ یہ مقاصد کیا ہیں ان پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اگر آپ ان سب کو چند الفاظ میں سمیٹنا چاہتے ہیں تو یہ ہے۔

مضبوط پاکستان مضبوط تر پاکستان

یہی وہ مقصد ہے جس نے صدیوں سے ہماری روح کو بے قرار کر رکھا ہے۔ جس نے ہمیں جینے کا سلیقہ عطا کیا ہے۔ جس نے ہمیں اوروں سے ممتاز کر دیا ہے جس کے ارتعاش سے سرسید محمد علی جوہر، اقبال اور قائداعظم وجود میں آئے۔ اس مقصد سے ہم آہنگی اور جدوجہد ہی معاشرہ میں کسی کے مقام کے تعین کا معیار ہے۔ تو دوستو جب تک اس معاشرہ میں ماہرینِ طبیعات اپنی زندگی کو ایک مضبوط پاکستان۔ مضبوط تر پاکستان کے مقصد سے ہم آہنگ نہیں کر لیتے وہ اس ملک میں اپنا صحیح مقام نہیں پا سکتے۔ میں بات سے متفق ہو سکتا ہوں کہ یہ علوم طبیعی سے سراسر زیادتی ہے کہ ہم اسے بھی معاشرہ کی ضروریات کی قیود میں جکڑ رہے ہیں۔ لیکن وہ کونسا ملک ہے وہ کون سی سوسائٹی ہے جس کے سائنس دان اور ماہرینِ طبیعات اپنے گرد و پیش کی ضروریات سے بالاتر اور بے نیاز ہو کر کسی اور ہی دنیا کے مسائل حل کرنے میں لگے ہوئے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی ضروریات سے کٹ کر کوئی بھی علم ترقی نہیں کر سکتا۔ تو سب سے پہلی ذمہ داری جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہم ماہرینِ طبیعات سب سے پہلے اپنی سوچ اور سعی کو اپنے معاشرہ کے حل کرنے میں صرف کریں اور علاقائیت میں آفاقیت ہے۔ کم از کم دنیا کے دو تہائی انسان انہیں مسائل اور مصائب میں سے گذر رہے ہیں جن کا ہمیں سامنا ہے۔

حلقہ ہائے ارباب علوم طبیعی

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مسائل کا صحیح تعین کیسے کیا جائے۔ اور ماہرین علوم طبیعی اپنے لئے کیا چنیں؟ یہ ذمہ داری بھی ہمیں پر عائد ہوتی ہے کہ ہم ان مسائل کی نشاندہی کریں جن میں ہمارا علم، تجربہ اور فن کام آ سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں علوم طبیعی کی علاقائی مجلسیں تشکیل دینے کی تجویز پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

ہمارے ہر چھوٹے بڑے قصبہ میں فنون لطیفہ ادب اور شعر کی ترقی کے لئے حلقے بنے ہوئے ہیں۔ کہیں یہ حلقہ ارباب ذوق ہے تو کہیں حلقہ ارباب شعور کا نام ہے۔ ان حلقوں میں ادیب اور نقاد حضرات ہفتہ وار مل بیٹھ کر فنون لطیفہ کی آبیاری کرتے ہیں تو پھر جو ماہرینِ طبیعات ہیں یا علوم طبیعی سے وابستہ ہیں وہ ایسی مجلسوں کا انعقاد کیوں نہیں کر سکتے؟ قدرت کے رازوں پر سے پردہ اٹھانا، ان پر بحث و تمحیص کرنا، ایجاد اور اختراع کا ذکر کرنا، فنی اور صنعتی مسائل کا حل پیش کرنا۔ آخر ان سب سے زیادہ کیا دلچسپ ہو سکتا ہے؟

ماہرینِ علوم طبیعی کے ان حلقوں سے مندرجہ ذیل فوائد متوقع ہیں۔

۱۔ مقامی ماہرین ایک دوسرے کو پہچاننے لگیں گے۔

۲۔ ان مجلسوں میں جب علوم طبیعی سے متعلق حضرات اور طالب علم بیٹھیں گے تو ان کی رسائی ماہرین تک خود بخود ہو جائے گی اور وہ ان کے علم اور تجربے سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

۳۔ بہت سارے دماغ جب ایک مقصد اور پروگرام کے تحت مل کر بیٹھیں گے تو مسائل کی مسلسل نشاندہی ہوتی رہے گی۔ اور ان کے حل بھی عیاں ہونے لگیں گے۔

۴۔ مقامی طور پر ایجاد، اختراع اور صنعتی و فنی ترقی کی حوصلہ افزائی ہوگی اور مصنوعات کا معیار بہتر ہوتا رہے گا۔

۵۔ یہ مجلسیں حکومت کے فنی اور صنعتی منصوبوں کے لئے بے حد معاون اور مددگار ہو سکتی ہیں۔ خاص کر مقامی منصوبوں میں حلقہ ہائے ارباب علوم طبیعی مشعل راہ ثابت ہو سکتے ہیں

۶۔ ملک میں سائنسی شعور بلند ہونے میں مدد ملے گی۔

عوام کا فنی شعور

ملک میں سائنسی شعور بلند کرنے کے لئے ماہرین علوم طبیعی پر ایک اور بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہم اپنے علم اور تجربے کی بنا پر ملکی مسائل کا حل تو پیش کر دیں گے لیکن کیا اس حل کو ہم عملی طور پر بھی نافذ کر سکیں گے۔ اس کے لئے ضروری ہو گا کہ عوام کا تعاون حاصل ہو۔ قوم میں فنی اور صنعتی انقلاب کے لئے آبادی کے ہر طبقہ کو حصہ لینا ہوتا ہے۔ اس کی مثال ہمارے سامنے جاپان، ہانگ کانگ اور کوریا کے لوگوں کی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوم کے اس کردار کو کیسے اجاگر کیا جائے۔

یہاں پر ہمارا واسطہ پوری آبادی سے ہونا چاہئے۔ ملک کے ۸۰ فیصد عوام کو ناخواندہ سمجھ کر پس پشت نہیں ڈالنا چاہئے۔ ہمارا ان پڑھ طبقہ علوم طبیعی سے کس قدر مانوس ہے۔ اس کا اندازہ لگانا ہو تو گوجرانوالہ، سیالکوٹ اور لاہور کے محلوں میں چھوٹی چھوٹی کارگاہوں (ورکشاپوں) کو دیکھئے۔ ان میں بے شمار ہنرمند، کاریگر اور موجد ایسے ملیں گے جو بالکل ناخواندہ ہیں۔ اسی طرح کیا ہمارا کسان علم زراعت نہیں جانتا؟ کیا راج سول انجینئرنگ سے نابلد ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ یہ ان پڑھ لوگ اپنے کام کی نوعیت کے اعتبار سے ایک سطح پر اپنے ہی انداز کے سائنس دان ہیں۔

ضرورت یہ ہے کہ ان کو اس سے آگے بتایا جائے جو کچھ کہ وہ پہلے سے جانتے ہیں۔

ترسیل علم کتاب سے بھی ہے۔ آواز سے بھی ہے یہ مثال سے بھی ہے اور تصویر سے بھی۔ ان پڑھ طبقہ صرف کتابی ترسیل علم کے طریقہ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ لیکن باقی سب طریقوں سے وہ اپنے پڑھے ہوئے بھائیوں سے پیچھے نہیں۔

یہاں پر حکومت اور ماہرین علوم طبیعی پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ آبادی کے اس طبقہ کو فراموش نہ کریں بلکہ آنے والے فنی اور صنعتی انقلاب میں ان کی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے اقدام کئے جائیں تاکہ وہ ہماری بات سمجھ سکیں اور تخلیق کے عمل میں ہمارے دست راست بن سکیں اس کے لئے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ اجتماعی ہنرگاہیں (MASS SKILL CENTRE)

اجتماعی ہنرگاہیں علاقہ کی مخصوص ضروریات کے تحت تشکیل دی جائیں جن میں مثال، آواز، تصویر کے ذریعے لوگوں کو طبیعیات کے بنیادی اصولوں سے واقفیت کروائی جائے۔ اور چند ہفتوں پر مشتمل مختلف سطحوں پر گروہ وار تربیتی نصاب و گروپ ٹریننگ کورسز چلائے جائیں۔

۲۔ گشتی کارگاہیں (چلتی پھرتی ورکشاپ) (MOBILE WORKSHOP)

اجتماعی ہنر گہ کے اصول پر گشتی کارگاہوں کا طریقہ بڑا کامیاب ہے یہاں گشتی کارگاہیں (مرکز ٹریننگ سنٹر) خود گاؤں گاؤں جاتا ہے۔ فلموں اور رسالوں کے ذریعے لوگوں میں اجتماعی طور پر فنی شعور بلند کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

۳ - ٹیلیویژن اور ریڈیو۔

ماہرین طبیعات ٹیلیویژن اور ریڈیو پر آکر قومی زبان میں سہل انداز میں بنیادی اصولوں اور سامان سے لوگوں کو واقف کرائیں۔

ان سب باتوں میں اہم ترین اصول یہ ہے کہ جن کو آپ پڑھانا چاہتے ہیں ان کی سطح پر اتر کر ان سے باتیں کریں۔

ملک کا موجودہ صنعتی مقام

ماہرین علوم طبیعی کے لئے سب حوصلہ افزا بات یہ ہے اس وقت صنعتی اور فنی لحاظ سے ہمارا ملک ایک مناسب مقام پر پہنچ چکا ہے۔ ہمارے تجزیہ کے مطابق مندرجہ ذیل صورت حال ہے۔

۱۔ ملک بھر میں بے شمار کارخانے اور کارگہیں (ورکشاپ) ہیں جن میں ہر نوع کی پرانی اور نئی مشینیں نصب ہیں۔ مجموعی حیثیت سے ان تمام کارگہوں کی گنجائش اور اہلیت کسی بڑے سے بڑے ملک کی بڑی سے بڑی کارگہ سے بھی زیادہ ہے۔

۲۔ اس طرح ملک میں اتنی تجربہ گاہیں کہ اجتماعی طور پر ہم دقیق سے دقیق مسائل حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

۳۔ ملک میں بے پناہ قوت برداشت کے مالک اور محنتی ہنرمند موجود ہیں جن کے ہاتھ پیچیدہ سے پیچیدہ کام سرانجام دے سکتے ہیں۔

۴۔ ملک میں قابل انجینئروں، ماہرین علوم طبیعی اور سائنس دانوں کی کمی نہیں۔ وہ بیرونِ ملک کام کرکے دنیا بھر میں اپنے علم اور قابلیت کی دھاک بٹھا چکے ہیں اب اگر ہم دنیا کے صنعتی کمالات کا جائزہ لیں تو سب سے اہم یہی چار عوامل ہیں۔ اس لحاظ سے پاکستان نہایت خوش نصیب ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری صنعتی اور فنی دنیا میں مندرجہ ذیل کمزوریاں بھی ہیں۔

۱۔ مختلف کارخانوں، تجربہ گاہوں، اہل ہنر اور ماہرین کے درمیان کوئی باہمی رابطہ نہیں ہے۔ چنانچہ اپنی اپنی جگہ پر سب ہی کمزور اور مجبور محسوس ہوتے ہیں۔ دوسری صورت میں ملکی ذرائع جن کو میسر ہیں وہ ہر لحاظ سے اپنے آپ کو خود کفیل (SELF SUFFICIENT) بنانے کے لئے کوشاں

۲۔ ملکی صنعت میں تحقیق، ڈیزائن، انجینئری، سائنس میں قابلیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ شاید ہی کسی کارخانہ یا صنعت میں باقاعدہ شعبۂ تحقیق ہو۔ کام روایات پر چلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور روایات ہی نہیں چنانچہ تحقیق اور ترقی کی فضا کی عدم موجودگی میں ہمارا فنی اور صنعتی ڈھانچہ جمود کا شکار ہے۔

۳۔ صنعت میں عام طور نام نہاد "کام چلاؤ" کے اصول کا ہے۔ "کام چلاؤ" ہمارے صنعتی کارکن کی عادت ثانیہ بن چکی ہے۔ صنعت (کوالٹی) حاصل کرنے کی لگن نہیں رہی چنانچہ مقامی مصنوعات کا معیار نہایت ادنیٰ ہے۔

۴۔ ملک میں بنیادی سامان نہیں بنتا اور اس طرف حکومت اور ملکی صنعت کاروں کی توجہ بھی نہیں۔

۵۔ عمراً نصب شدہ مشینیں بے احتیاطی اور نگہداشت کی وجہ سے اپنی صلاحیت مقررہ مدت (ڈیزائن لائف) سے

بہت پہلے لکھ دیتی ہے۔

۶۔ ملکی صنعتی گنجائش کا تصرف اس کی گنجائش سے کہیں کم ہے۔ اکثر حالات میں استعمال بھی بے جا ہے۔ چنانچہ نہایت قیمتی سرمایہ محنت اور قربانیوں سے منگوائی جانے والی مشینیں وقت کے بے رحم ہاتھوں تباہ ہو رہی ہے۔

۷۔ انتہا سے بڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے نئی مشینیں درآمد کرنا بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے پرانے کارخانوں کو جدید بنانے کا رجحان پنپ نہیں سکتا۔

اس کے ساتھ ساتھ ملک کی فنی اور صنعتی ترقی پر بھی ایک طائرانہ نظر بے موقع محل نہیں ہوگی۔ ملک کی بیشتر صنعتی ترقی اس طبقہ پر منحصر ہے جو کسی سطح پیمانے پر ماہرین طبیعات نہیں بلکہ اکثر ان کی طبیعات سے واقفیت سطحی ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے علوم طبیعی کو اپنے ماحول سے اپنایا اور اس کے او پر اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت ایجاد اور اختراعات کر کے ملکی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے چھوٹے چھوٹے کارخانے لگائے۔ گویا انہوں نے سائنس اور فنیات (ٹیکنالوجی) کو اپنے ہی وطن کی مٹی سے جنم دیا۔

دوسرا طبقہ جس کا ملکی صنعت اور فنی ترقی میں ہاتھ ہے وہ صاحب وسائل لوگ ہیں۔ انہوں نے بیرونی ممالک سے صنعت کو درآمد کیا اور اپنی فضا کا تجزیہ کئے بغیر یہاں کی مٹی میں پودا لگا دیا۔ چنانچہ ایسی بہت سی صنعتیں صرف ملکی وسائل کا ضیاع ثابت ہوئیں اور پروان نہ چڑھ سکیں۔

تیسرا اہم رول اس سمت حکومت نے ادا کیا اور بھاری بھرکم قرضوں کی بدولت ملک میں جو کچھ ملا لگا دیا۔ نتیجتاً آج جس ترقی کی خاطر ملک کا بچہ بچہ ہزاروں روپیہ کا مقروض ہے وہ خواب کبھی پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔

ملکی صنعت اور ماہرین علوم طبیعی کی ذمہ داریاں

اس تجزیہ کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں ملکی علوم طبیعی کے ماہرین پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

ملکی صنعت سے ماہرین طبیعات کی لاتعلقی کی بناء پر ہماری فنی اور صنعتی زندگی میں ایک جمود کی کیفیت ہے۔ چھوٹی صنعتیں جو کہ بے شک ابتدائی باہمت افراد کی محنت کا ثمر ہیں اب آگے نہیں بڑھ رہی ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہاں ابتدائی دور میں یہ معمولی بات (ٹیکنالوجی) تجربہ اور ہنر کی محتاج تھیں۔ اب آگے بڑھنے کے لئے انہیں اعلیٰ درجہ کے علوم طبیعی کی ضرورت ہے جس کی کمی صرف مدبرین علوم ہی پورا کر سکتے ہیں۔

بڑی بڑی صنعتوں میں حالت اس سے زیادہ دگرگوں ہے۔ مسلسل تحقیق اور ترقی کے بغیر آج کوئی صنعت پانچ سال سے زیادہ میدان میں نہیں ٹھہر سکتی۔ بین الاقوامی سطح پر جو مقابلہ اور تناؤ ہے اس سے آپ سب اچھی طرح واقف ہیں۔ بھلا جمود کی شکار پاکستانی صنعت اس کا کیسے مقابلہ کر سکتی ہے۔ یہ تو بھلا ہو حکومت کی ترجیحی پالیسی درآمدی پابندیوں اور نارواسرپرستی کا کہ یہ تھوڑا بہت چل رہی ہے۔ ورنہ کب کا ملک کا اربوں روپیہ صنعت میں لگا ہوا سرمایہ تنزلیت کی نذر ہو چکا تھا۔

ان حالات کو بہتر کون بنا سکتا ہے۔ کیا حکومت اور سرمایہ دار؟

خواتین و حضرات :۔

وقت کے اس الٹے چلتے ہوئے پہیئے کو صرف اور صرف ماہرین علوم طبیعی اپنی تحقیق اور ترقی کی بنیاد پر ہی بدل سکتے ہیں۔ اس کے لئے ہم پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن میں سے کچھ کا ذکر بیان کیا جا رہا ہے۔

۱۔ ہم مختلف نوع کی صنعتی اور فنی عمل گذاریوں کا جائزہ لیں اور اپنا تجزیہ پیش کریں کہ کہاں کہاں اور کس قدر علوم طبیعات کی مدد سے گرتی ہوئی صنعت کو سنبھالا دیا جا سکتا ہے۔

اس کے لئے ہمیں پاکستان میں طبیعات کے روائتی انداز کو بدلنا ہوگا اور کالجوں یونیورسٹیوں کے کلاس روموں سے نکل کر ان جگہوں پر جانا ہوگا جہاں پر علوم طبیعی بر سر عمل ہیں۔

۲۔ حکومت اور صنعتی رہنماؤں کو تحقیق اور ترقی کے فوائد سے آگاہ کرنا ہوگا۔ اس کے لئے ہمیں عملی علوم طبیعی کے میدان میں تحقیقی طرز کے مقالات لکھنے ہوں گے اور اپنے خیالات کو تمام تر حاصل شدہ ذرائع سے عام کرنا ہوگا۔

۳۔ چونکہ تحقیق کی اہمیت اور قدر واضح نہیں اس لئے اکثر ہمارا صنعتی طبقہ اسے بے فائدہ سمجھ کر اس کی پذیرائی کے لئے تیار نہیں۔ ماہرین طبیعات کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اس کی تحقیق اور مساعی سے کیسے فائدہ پہنچ رہا ہے۔ محض باتوں سے زیادہ عملی میدان میں کوشش کی ضرورت ہوگی۔

بات کا آغاز ماہرین طبیعات کی صنعت میں ذمہ داریوں سے اس لئے ہوا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ ہم تو صرف ناصح ہیں۔ گفتار کے غازی تو ہیں لیکن کردار کی طرف توجہ نہیں دے رہے۔ ماہرین علوم طبیعی اس کردار کے لئے تیار ہیں لیکن فضا کو سازگار بنانے کے لئے حکومت اور صنعتی کرم فرماؤں پر مندرجہ ذیل ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

۱۔ حکومت ہر بڑے صنعتی ادارے میں تحقیق اور ترقی کے شعبہ کو لازمی قرار دے جس کا سربراہ کوئی ماہر علوم طبیعی اور اس سلسلہ میں اگر کوئی قانون بنانا پڑے تو یہ بلا تاخیر کیا جائے۔

۲۔ تحقیق میں استعمال ہونے والا سامان درآمدی پابندیوں سے مستثنےٰ قرار دیا جائے تاکہ تحقیق کے لئے صنعت کار ضروری سامان مہیا کر سکیں۔

۳۔ تحقیق اور ترقی سے منسلک حضرات پر خرچ ہونے والی رقوم کو ٹیکس سے چھوٹ دی جائے تاکہ صنعتکاروں کی اس طرف حوصلہ افزائی ہو۔

۴۔ حکومت اور صنعت کار مل کر ملک میں ایک صنعتی انعامی فنڈ قائم کریں جس میں ہر سال ماہرین کی سرکردگی میں بہترین ایجادات، اختراعات معیار، کارکردگی اور پیداوار وغیرہ کے پیش نظر مستحق افراد اداروں صنعتوں اور کارخانوں کو ملکی سطح پر انعامات سے نوازا جائے۔ اس طرح کے انعامات صنعت کی دنیا میں بہتر کارکردگی حوصلہ افزا نتائج میں بڑے معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

پاکستان اور اعلیٰ درجے کی صنعتی مصنوعات (PAKISTAN AND HIGH TECHNALOGISTS)

اس سے پہلے ہم ملکی صنعت کے موجودہ مقام کا تعین اور تجزیہ پیش کر چکے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کا موجودہ صنعتی ڈھانچہ کس طرح کے صنعتی کمال کا متحمل ہے۔

صنعتی مصنوعات دو قسموں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

(الف) اعلیٰ مصنوعات

(ب) عمومی مصنوعات۔

اعلیٰ مصنوعات عموماً اعلیٰ فنیات (ہائی ٹیکنالوجی) کے زمرے میں آتی ہیں اور ان میں سے بیشتر خاص طور پر بنوائی جاتی ہیں۔ میرا مطلب (CUSTAM BUILT) یکنالوجیز سے ہے جن میں بجلی پیدا کرنے کے کارخانے (پاور پلانٹ) جوہری تعامل گر (نکلیئر ری ایکٹر) خلائی فنیات اعلیٰ درجے کے دفاعی ہتھیار اور دوسرے قیمتی فنی لوازمات ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں بھی ان کی پیداوار حسب فرمائش کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استعمال شدہ سامان کی قیمتوں کی نسبت سے ایسی مشینوں اور کارخانوں کی قیمت ہزاروں گنا مقرر کی جاتی ہے۔

عمومی مصنوعات سے میری مراد روزمرہ استعمال کی صنعتی اور گھریلو مصنوعات سے ہے۔ ان کے بیچھے کثیر پیمانے کی پیداوار کے عوامل ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی قیمت بھی کم ہوتی ہے۔ لیکن ان کو بنانے والے کارخانے (پلانٹ) انتہائی مہنگے اور اعلیٰ فنیات کا نمونہ ہوتے ہیں۔

اپنے تجزیہ اور تجربہ کی بناء پر یہ کہنے میں مجھے کوئی جھجک نہیں کہ اس وقت پاکستان اعلیٰ فنیات (ہائی ٹیکنالوجیز) کے میدان میں ایک بلند مقام رکھتا ہے۔ یعنی پاکستان پاور پلانٹ جوہری تعامل گرد نکلیئر ری ایکٹر) اعلےٰ درجے کا دفاعی سامان بڑے راڈار سب مشینیں (کمپیوٹرز) خلائی سامان وغیرہ بنانے کے قابل ہو سکتا ہے کہ کچھ حضرات کو میری بات حیران کن یا ناقابل یقین معلوم ہو لیکن جو لوگ (CUSTAM BUILT) ٹیکنالوجی کے عوامل سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں وہ حیران نہیں ہوں گے۔ آپ کے لئے یہ اچنبھے کی بات نہیں کہ کوئی آدمی یہ دعویٰ کرے کہ اس نے گھر بیٹھے ایک اعلیٰ درجے کا ٹی وی سیٹ جوڑ لیا ہے۔ درحقیقت ایسا تو اکثر لوگ کر لیتے ہیں۔ لیکن اچنبھے کی یہ بات ضرور ہوگی کہ کوئی آدمی کہے کہ اس نے گھر بیٹھے ایک ہزار ٹی وی سیٹ تیار کر لئے ہیں۔ ہزار سیٹ بنانے کے مسائل ایک سیٹ بنانے کے مسائل سے قطعی مختلف ہیں۔ ایسے ہی ایک سوئی بنانا مشکل نہیں ایک لاکھ سوئیاں بنانا ایک مسئلہ ہوگا۔

کم تعداد میں کوئی بھی چیز بنائی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس کے لئے مخصوص صنعتی ڈھانچہ موجود ہو۔ پاکستان میں چونکہ ایک صنعتی ڈھانچہ موجود ہے اس ہم کسٹم بلٹ ہائی ٹیکنالوجیز (جن کی ضرورت کم تعداد میں ہوتی ہے) کے لئے نہایت موزوں ہیں۔

(اعلیٰ فنیات کے میدان میں ماہرینِ علوم کی ذمہ داریاں

اعلیٰ فنیات (ہائی ٹیکنالوجز) میں پاکستان کی خود کفالت کا مسئلہ نہایت اہم ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے عزیز ملک کی بقا اس پر منحصر ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ اس لحاظ سے ماہرینِ علوم طبیعی پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اعلیٰ صنعتی کمالات برپا کرنے کے لئے موجودہ صنعتی ڈھانچہ کو اعلیٰ ماہرینِ علوم طبیعی کی ضرورت ہوگی۔ درحقیقت اعلیٰ ماہرین علوم طبیعی کے بغیر اعلیٰ صنعتی کمالات کا تصور بھی ممکن نہیں خواہ صنعتی ڈھانچہ کتنا بھی مضبوط کیوں نہ ہو۔

چونکہ اس ملک میں ضروری ماہرین علوم طبیعی موجود ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اس لئے اس جانب سے ہمیں ڈر نہیں۔ اصل مسئلہ حکومت اور اس کے مشیروں کو قائل کرنے کا ہے کہ ہم اس قابل ہیں۔ ہمیں استعمال کر کے تو دیکھئے

ملکی صنعتی ڈھانچہ سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ تو کیجئے۔ بدقسمتی سے اس ملک میں صنعتی خودکفالت کے خلاف دو مضبوط طاقتیں کام کر رہی ہیں۔ ایک شکست خوردہ ذہن جو اس بات کا قائل ہے کہ اس ملک میں تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

دوسرے ایک مفاد پرست گروہ جو بغیر کچھ کئے بیرونی صنعت کاروں سے لاکھوں کروڑوں کا کمیشن کھا رہا ہے۔ اور خود کفالت کا مطلب وہ "اپنا بزنس بند" کے نام سے سمجھ رہا ہے۔

خودکفالت کے لئے کوشاں حضرات کو ان دونوں گروہوں سے زبردست جنگ کرنا ہوگی۔ چونکہ ایسے گروہ حکومت کے اندر اور باہر دونوں جگہ موجود ہیں اس لئے شروع میں اس جنگ کا پانسہ انہی مفاد پرست یا کمزور ذہنوں کے حق میں نظر آئے گا لیکن یقین محکم اور عمل پیہم کی بدولت رفتہ رفتہ ماہرین علوم طبیعی اپنی یہ جنگ بھی جیت جائیں گے۔

اعلیٰ فنیات (اعلیٰ ٹیکنالوجیز) میں خودکفالت سے قطع نظر کرنے کے نتائج

اگر ماہرین علوم طبیعی اور دوسرے لوگوں نے اعلیٰ فنیات میں خودکفالت کو اس وقت بھی نظر انداز کر دیا تو اس کے نتائج اجتماعی خودکشی کے مترادف ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ کانوں پر میرے یہ سخت لفظ گراں گذریں لیکن حقیقت یہی ہے۔ پاکستان جیسے غریب ملک کے لئے مستقبل قریب میں بجلی پیدا کرنے کے کارخانے (پاور پلانٹ) جوہری تعامل گر، دفاعی ضروریات کا اعلیٰ سامان برقیات (الیکٹرانک) کے ضروری آلات کا حصول انتہائی مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہو جائے گا۔ اس کی بڑی وجہ تو ان مصنوعات کی بے بہا قیمت ہوگی جو پاکستان کسی صورت میں بھی ادا نہیں کر سکے گا۔

اس وقت ہم صرف قومی زندگی کے صرف ایک اہم شعبہ کی طرف اشارہ کریں گے۔ یہ ہے "توانائی کا شعبہ" توانائی اور ملکی معیشت اور دفاع کا ساتھ آسانی سے سب لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ توانائی اور تمام مصنوعات اور تمام معاشی عوامل کے لئے روح کے مانند ہے۔

اس وقت دنیا میں توانائی کے ہر طرح کے وسائل کی قیمتیں جس تیزی سے بڑھ رہی ہیں اس کے پیش نظر یہ سمجھنا مشکل نہیں ہونا چاہئیے کہ تھوڑے ہی سالوں میں ہمارے ملک کے لئے توانائی کے وسائل کا حصول تقریباً ناممکن ہو جائے گا۔ پانچ سال پہلے تیل دو ڈالر فی بیرل سے کم تھا۔ آج یہ ۲۵ ڈالر ہے۔ پانچ سال بعد یہ ۵۰ سے ۶۰ ڈالر (۶۰ ملین) ڈالر تھی۔ آج اس کی قیمت ۴۰ کروڑ (۴۰۰ ملین) ڈالر ہے۔ اور پانچ سال بعد اس کی قیمت نوے کروڑ (۹۰۰ ملین) ڈالر کے لگ بھگ ہوگی۔ ہم نے پاکستان کی بڑھتی ہوئی توانائی کا مکمل جائزہ لیا ہے۔ آج ہم صرف ۲۵۰۰ میگاواٹ پیدا کرتے ہیں۔ آج سے ۲۰ سال بعد ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی اور استعمال کے پیش نظر ۲۰۰۰۰ میگاواٹ کی ضرورت ہوگی۔ اس توانائی کو پیدا کرنے کے لئے کم از کم ملک کو تیس ارب (۳۰ بلین) ڈالر خرچ کرنا پڑیں گے۔ لیکن قومی مصارف کی مدیں تو اور بھی بہت ہیں۔

ایسے میں دوستو۔ روپے کی ان ضروریات کو کوئی ٹیکس، کوئی امداد پورا نہیں کر سکے گی۔ یہ رقم کہاں سے آئے گی۔ اس کا حل ایک ہی ہے وہ ہے خودکفالت۔ لیکن اگر سائنس اور فنیات کی ترقی کی یہی رفتار رہی تو جناب والا نوشتہ دیوار سامنے ہے۔ ۱۹۹۰ء تک حال یہ ہوگا کہ

۱۔ ہمیں گھروں میں، کھیتوں میں، کارخانوں میں بجلی راشن پر ملا کرے گی۔

۲۔ کھربوں روپیہ کی لاگت سے لگا ہوا بجلی پر منحصر سامان کارخانے، ٹیل کنوئیں، گھریلو اور صنعتی سامان اپنی نہایتی پیداواری گنجائش سے کم پر چل رہا ہوگا اور ختم ہو جائے گا۔

۳۔ ہم غیر ملکوں سے بجلی درآمد کرنے پر مجبور ہوں گے۔ لیکن بجلی کی اس رو کی قیمت ہمیں اپنی آزادی کی رو کی شکل میں چکانے کو کہا جائے گا۔

۴۔ توانائی کی کمی سے پانی کی بھی شدید کمی ہوگی جس سے ہماری رہائش زراعت اور صنعتی زندگی بری طرح متاثر ہو رہی ہوگی زمین کا آدھا حصہ سیم اور تھور کی نظر ہو چکا ہوگا جس سے خوراک کے بے پناہ مسائل پیدا ہو جائیں گے۔

۵۔ آبادی کا پڑھا لکھا اور مہذب طبقہ اسی میں اپنی نجات سمجھے گا کہ ملک چھوڑ کر بھاگ جائے اور ملک میں افراتفری اور مہنگائی سے کسی اور جگہ پناہ لے۔ یہاں ملک میں ایک جھوک رہ جائے گا جو معاشرتی اور سیاسی مسائل پیدا کرے گا۔

ایسے حالات میں کیا استحکام اور کیا امن اس پر تو کوئی سیاسی لیڈر ہی کچھ کہہ سکتا ہے لیکن ماہرین طبیعیات ٹھوس سائنسی حقائق سے آنکھیں نہیں بند کر سکتے۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم قوم کو مستقبل کے ممکنہ حالات سے آگاہ کریں کہ اصل مسائل کی طرف توجہ مبذول کی جائے ورنہ وقت کا بے رحم ہاتھ ہم سب کو اجتماعی خودکشی کی طرف دھکیلے جا رہا ہے۔

اس لئے اس اجلاس میں ہم ماہرین علوم طبیعی پُرزور سفارش کرتے ہیں کہ حکومت [illegible] منذکرہ بالا منصوبوں میں جلد از جلد خود کفالت کو اپنا اہم ترین مقصد بنائیں اور اس کا آغاز توانائی کے منصوبوں سے کیا جائے چونکہ توانائی زندگی کے تمام شعبوں میں روح کی حیثیت رکھتی ہے۔

قرآن اور علوم طبیعی

ابھی تک میں ایسی باتیں کر رہا ہوں جن کو بعض حضرات غیر سائنسی کہلائیں گے لیکن جب منتظمین نے ایک انجینئر کو شعبہ علوم طبیعی کی صدارت کے لئے مدعو کر لیا تو اس کے علاوہ اور کیا توقع کی جا سکتی تھی لیکن ان تلخ حقائق کے بعد مجھے اس اجلاس میں اعلیٰ دماغوں کی نسبت سے بھی کچھ ضرور کہنا چاہیئے۔

جناب والا ہم مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی سے جو اس قدر مرعوب ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا رشتہ ہمارے اپنے تاریخی ورثہ سے کٹ چکا ہے لیکن ہمارے پاس علم حکمت کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو تاریخ سے بالاتر ہے۔ جو وقت سے بے نیاز ہے۔ میرا مطلب قرآن حکیم سے ہے۔ قرآن تمام سائنس دانوں بالخصوص ماہرین علوم طبیعی کے لئے روشنی کا ایک ایسا مینار ہے جس کی ہر شعاع کائنات کے کسی نہ کسی راز کو آشکار کر رہی ہے۔

اس کتاب کا مصنف وہ ہے جس نے وہ سب کچھ بتایا جو اس وقت تک انسان نے دریافت کر لیا ہے۔ اور وہ بھی جو انسان ابھی تک معلوم نہیں کر سکا۔ اس لئے قرآن مسلمان سائنس دانوں اور ماہرین طبیعیات کے لئے خاص دلچسپی کا حامل ہے۔ یوں تو قرآن کی ہر آیت غور طلب ہے اور اس کتاب میں علوم طبیعی کے ماہرین کے لئے بے شمار ایسے اشارات ہیں جو کہ آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت سے کم اہم نہیں ہوں گے لیکن اس موقع پر میں صرف قرآن اور علم الاعداد پر مختصر تبصرہ کروں گا۔

اس مسئلہ کی ابتدا ہی قرآن کی پہلی آیت بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ سے ہوتی ہے اگر آپ اس کے حروف کا شمار

کریب توان کی تعداد ۱۹ ہے۔ اس آیت میں چار لفظ ہیں۔ بسم۔ اللہ۔ رحمٰن۔ رحیم۔ حیران کن بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک لفظ جتنی مرتبہ سارے قرآن میں ذکر ہوا ہے وہ ہمیشہ ہی ۱۹ کا حاصل ضرب۔ پہلا لفظ اسم سارے قرآن میں ۱۹ دفعہ واقع ہوا ہے۔ دوسرا لفظ اللّٰہ ۲۶۹۸ دفعہ بیان ہوا ہے جو کہ ۱۹ کا حاصلِ ضرب ہے۔ (۱۴۲ × ۱۹) تیسرا لفظ الرحمٰن ۵۷ مرتبہ جو کہ ۳ × ۱۹ ہے اور الرحیم قرآن بھر میں ۱۱۴ مرتبہ آیا ہے جو ۶ × ۱۹ ہے۔ اور قرآن کی سورتیں بھی ۱۱۴ ہی ہیں۔

۱۹ کی اہمیت صرف یہی نہیں بلکہ مزید تحقیق سے معلوم ہو کہ ۱۹ کا ہندسہ اپنے میں کوئی عجیب اشارہ رکھتا ہے یہ دیکھا گیا کہ قرآن کی ۲۹ سورتیں عربی زبان کے ۱۴ حروفِ تہجی کے ۱۴ مختلف جوڑوں سے شروع ہوتی ہیں مثلاً الم۔ یٰسین۔ طہٰ۔ ص۔ ق۔ نون۔ حم۔ الف لام را۔ طسم وغیرہ جن ۱۴ حروف سے یہ ۱۴ مخفف الفاظ مرکب ہیں وہ یہ ہیں۔

الف۔ ح۔ ر۔ س۔ ص۔ ط۔ عین۔ ق۔ گ۔ ل۔ م۔ ن۔ ہ۔ ی

ابھی تک ماہرینِ لغت کے لئے یہ مخفف الفاظ مسئلہ لاینحل ہیں۔ نہ صرف یہ لاینحل بلکہ اب یہ معلوم ہوا کہ ان سب اشارں میں بھی عدد ۱۹ مسلسل اور بلا تفریق اہمیت رکھتا ہے۔

پہلی بات تو یہی دیکھ لیں کہ ۱۴ حرف ۱۴ الفاظ اور ۲۹ سورتیں جن کا ان سے آغاز ہوتا ہے سب کا مجموعہ ۵۷ ہے جو ۱۹ کا حاصلِ ضرب ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ عقل کو ششدر کر دینے والی بات یہ ہے کہ ان ۱۴ حرفوں میں ہر ایک انفرادی طور پر جتنی بھی مرتبہ ان سورتوں میں آیا ہے وہ ۱۹ کا لازمی حاصلِ ضرب ہے۔ مثلاً سورہ ق (۵۰) میں حرف "ق" ۵۷ دفعہ ظاہر ہوا جو ۳ × ۱۹ ہے۔ سورہ الشوریٰ بھی حرف ق سے شروع ہوئی۔ اور اس میں بھی ق ۵۷ دفعہ آیا۔ آگے چلیئے۔

سورۃ القلم (۶۸) حرف "ن" سے شروع ہوئی۔ اس پوری سورت میں یہ حرف ۱۳۳ دفعہ لکھا گیا ہے جو کہ ۷ × ۱۹ ہے اسی طرح باقی حروف مخفف اور ان سے شروع ہونے والی سورتوں میں ۱۹ کا عدد بلا تفریق ہے۔ ۱۹ کی یہ تکرار اتفاقیہ نہیں ہو سکتی۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ صناعِ کائنات نے اس میں ۲۱ ویں صدی کے انسان کے لئے کوئی بہت بڑا راز رکھا ہے۔ آیئے ہم اس پوشیدہ راز کو دریافت کریں۔ لیکن ماہرینِ علوم طبیعی پر بات ختم نہیں ہوتی۔ قرآن کی ایک آیت انسان کو غور کی دعوت دیتی ہے۔ ہم اس پر کب غور کریں گے۔ کیا ہماری سوچوں پر قفل لگے ہوئے ہیں۔

مجھے احساس ہے کہ میں نے آپ کا بہت سا قیمتی وقت لے لیا ہے۔ لیکن جب بات ہمارے معاشرہ میں ماہرینِ علوم طبیعی کے حقوق اور ذمہ داریوں پر ہو تو اس کا طویل ہونا لازمی تھا۔ بلکہ ابھی بھی بہت سی باتیں تشنہ رہ گئیں۔ لیکن سو باتوں کی ایک بات ہمارے ضمیر کی آواز ہے جو ہمیں پکار پکار کر جگا رہی ہے کہ ہمارا مقصود

مضبوط پاکستان۔ مضبوط تر پاکستان

اور

صنعتی خود کفالت اس کے لئے واحد راستہ ہے

والسلام۔

ہیگل

مبارک علی

جارج ولہیم فریڈرش ہیگل ۱۷۷۰ء میں اسٹٹ گارڈ کے مقام پر پیدا ہوا اعلیٰ تعلیم ٹیوبن گن یونیورسٹی میں حاصل کی۔ زمانہ طالب علمی میں کانٹ اور روسو کے نظریات سے متاثر ہوا، تعلیم کے بعد درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ برلن اور فرینکفرٹ میں پڑھانے کے بعد ینیا یونیورسٹی میں پروفیسر ہوگیا۔ نپولین کی فتوحات نے جرمنی کو بری طرح متاثر کیا۔ اور ینیا یونیورسٹی کچھ عرصہ کے لیے بند ہوگئی، اس پر ہیگل نیورمبرگ چلا گیا۔ ۱۸۱۶ء میں وہ ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں پروفیسر ہوا۔ پھر ۱۸۳۱ء میں فختے کی جگہ برلن یونیورسٹی میں فلسفہ کا پروفیسر مقرر ہوا جہاں آخر وقت تک پڑھانے میں مصروف رہا۔ ۱۸۳۱ء میں اس نے وفات پائی۔

ہیگل کی تصانیف نے انیسویں صدی کے فلسفہ، سیاست، اور عمرانی علوم کو بڑا متاثر کیا، اس کے خیالات و نظریات کی چھاپ اس دور کے ہر فلسفی کے نظریات میں پوری طرح نمایاں ہے۔ آخر عمر میں ہیگل نے "فلسفہ تاریخ" پر لکچر دیے۔ جنھوں نے نظریہ تاریخ میں انقلابی اضافہ کیا۔

تاریخ میں واقعات کا انبار، ان کی تراش و خراش، کمتر یونت، کانٹ چھانٹ، اور ترتیب معلومات کا ایک ذریعہ تو ہو سکتی ہے۔ لیکن محض واقعات کوئی تاثر، اور کوئی شعور و احساس پیدا نہیں کرتے۔ اس لیے اس شعور و احساس کو پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ واقعات کے پس منظر میں جو اسباب، وجوہات اور حالات ہوتے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے، ان پر تنقید و رائے زنی کی جائے، ان کی اصل روح کو سمجھا جائے، اور واقعات کے سلسلہ و ترتیب کو دیکھا جائے، تو اسی صورت میں تاریخ افادیت کی حامل ہو سکتی ہے۔

ہیگل تاریخ کا مقصد یہ نہیں سمجھتا کہ صرف اور صرف واقعات کا تعین کیا جائے انھیں زماں و مکاں میں، اور خاص ادوار میں بیان کیا جائے۔ بلکہ تاریخ کا اولین فرض یہ ہے کہ ان اسباب و علل اور دلائل پر غور کیا جائے جنھوں نے یہ واقعات پیدا کئے ہیں اسی لیے فلسفہ تاریخ، انسانی تاریخ کو سمجھنے میں بڑا مددگار ہے، اور اسی فلسفہ تاریخ کی روشنی میں انسانی تاریخ کو ابتدا سے لیکر موجودہ ترقی یافتہ زمانہ تک سمجھا جا سکتا ہے۔

انسانی تاریخ کے مطالعہ کے بعد جو سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ انسان نے دور وحشت و بربریت سے اس مہذب زمانہ تک یہ ترقی کیوں کی؟ انسانی ڈرامہ جو اس اسٹیج پر کھیلا جا رہا ہے۔ اسکا پلاٹ کیا ہے؟ اور انسان جس مقصد کے لیے جد و جہد کر رہا ہے وہ کیا ہے؟ اور اس میں اسے کس حد تک کامیابی ہوئی ہے۔

ہیگل انسانی جدوجہد، کوشش، ترقی، اور انسانی عروج وبلندی کے پس منظر میں عمل پذیر جذبہ کو "آزادی" کے نام سے موسوم کرتا ہے، اس کے نزدیک انسانی تاریخ اور انسانی ڈرامہ کا پلاٹ "آزادی کی ترقی" ہے۔ آزادی سے مراد وہ حقوق اور قانون ہیں جس کے نتیجہ میں ریاست وجود میں آتی ہے یہ آزادی روح کا جوہر ہے اور تاریخ فلسفہ روحِ فلسفہ کا ایک حصہ ہے اس لیے تاریخ کا موضوع سائنس سے جدا ہے کیونکہ فلسفہ تاریخ اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ ریاست کس طرح وجود میں آئی؟ چونکہ انسانی آزادی، اور آزادی کا احساس ایک چیز ہے لہذا آزادی کا ارتقاء، شعور وذہن کا ارتقاء ہے اور اس میں ہر قسم کے افکار تشکیل پاتے ہیں اس لیے فلسفہ تاریخ صرف انسانی عمل ہی کو ظاہر نہیں کرتا، بلکہ وہ کائناتی عمل سے بھی پردہ اٹھاتا ہے۔

ہیگل روح (SPIRIT) اور مادہ (MATTER) کی خصوصیات بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ مادہ کا جوہر کشش ثقل (GRAVITY) ہے اور روح کا جوہر آزادی ہے۔ اور یہ آزادی روح کی مکمل حقیقت ہے یہ آزادی کن ذرائع سے ترقی کرتی ہے؟ دراصل یہی تاریخ کا موضوع ہے، تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی عمل کی بنیاد اسکی ضرورتوں، اور خواہشات پر ہے، انسانی جذبات، کردار اور صلاحیتں معاشرے میں حرکت پیدا کیئے رکھتی ہیں ان خواہشات وضروریات میں چند اعلیٰ وارفع جذبات بھی شامل ہیں۔ مثلاً سخاوت، یا حب الوطنی لیکن اُن کی اہمیت دوسروں کے مقابلہ میں کم ہے ذاتی مقاصد اور خود غرضی سب سے زیادہ انسان میں حرکت پیدا کرتی ہے ان کی طاقت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ قانون اور اخلاق کو جو ان پر پابندی عاید کرتے ہیں، انھیں توڑ کر اور نظر انداز کر کے اپنے مقاصد کی تکمیل کراتے ہیں۔

ہیگل کے نزدیک ریاست وہ شے ہے جس میں فرد پوری طرح آزادی سے فیض یاب ہوتا ہے لیکن یہاں اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ چند افراد تمام آزادی پر قابض نہ ہوجائیں، بلکہ اسے اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ہر فرد کو اس کا اپنا حصہ مل سکے۔ اس سے معاشرہ میں پابندیاں ضروری ہیں تاکہ تمام افراد آپس کی مرضی سے آزادانہ زندگی گذار سکیں۔

تاریخ میں ریاست کا وجود انسانی مقصد کی انتہائی تکمیل ہے انسان جن خصوصیات کا مالک ہے وہ سب اسے ریاست کی بدولت ملتی ہیں۔ ریاست ایک الہیاتی دستور ہے، جو اس سرزمین پر عملی شکل میں موجود ہے اس لیے ریاست میں تاریخ کے مقصد کو پایا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں آزادی اپنا مقصد پورا کرتی ہے اور قانون روح کی مقصدیت بنتا ہے، اس لئے وہ خواہش جو قانون کی تابع ہو وہ آزاد ہے کیونکہ اس طرح وہ خود کی فرماں بردار ہے، جب انسان اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیتا ہے تو آزادی اور ضرورت دونوں ختم ہوجاتی ہیں۔ ریاست کا وجود افراد کو سرگرم عمل رکھتا ہے اور معاشرے کا نظام اخلاق بناتا ہے۔ قوانین، انتظام، اور ریاست کے ارکان کے حقوق ملکر ریاست کا دستور پیدا کرتے ہیں۔ جب کہ فطری پہلو مثلاً پہاڑ، آب وہوا، پانی ایک ملک کا تصور بناتے ہیں، جائداد، آباواجداد کی تاریخ، اور ان کے کارنامے، ماضی کا ورثہ، اور اس ورثہ میں ان کا وجود یہ سب وطن کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے جو قوم ان حالات میں ارتقاء کرتی ہے، اسکی ذہانت کو انھیں حالات میں سمجھنا اور دیکھنا چاہیے۔

ہیگل اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ تاریخ ایک سلسلہ ہے۔ تاریخ کا ہر دور ایک دوسرے سے ملا ہوا ہے ماضی حال سے پیوست ہے ہر قوم اپنی ترقی کے بعد اپنا ورثہ چھوڑ دیتی ہے جو تاریخی ترقی کے عمل میں کام آتا ہے اسی لیے قومیں پیدا ہوتی ہیں اور مرجاتی ہیں لیکن مرتے وقت وہ اپنے افکار اور خیالات چھوڑ جاتی ہیں جو آنیوالی نسل کے تازہ اور نوخیز ذہن وشعور میں جذب ہوجاتے ہیں اس جدلیاتی

عمل میں انسانی ذہن زندگی کی نت نئی تبدیلیوں اور تجربات میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا رہتا ہے۔

ہیگل جب تبدیلی و ترقی عروج و زوال، تراش و خراش اور تعمیر تخریب، شکست و ریخت کے موضوع پر بحث کرتا ہے تو وہ اس تبدیلی و ترقی کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے ایک فطری، جس میں تبدیلی و ترقی اندھی اور غیر شعوری احساس کے ساتھ ہوتی ہے۔ دوسری تاریخی، جس میں یہ ترقی اور تبدیلی، شعوری قلبی اور عقل و ذہن کے ساتھ ہوتی ہے اس لیے فطری قوانین تاریخ میں ثابت نہیں ہوتے کیونکہ فطرت کوئی تاریخ نہیں رکھتی۔ بلکہ وہ ایک چکر میں گردش کرتی رہتی ہے اور اس بار بار گردش سے، جو فطرت ابھر آتی ہے اس سے نہ تو کچھ تغیر ہوتا ہے اور نہ ہی کچھ بنتا ہے۔ ہر روز سورج کا طلوع ہونا، ہر بہار کا آنا، اور ہر ادنیٰ ہر کارہ پوش ہو جانا فطرت میں یہ سب اپنا آخری اور قطعی کردار ادا کرتے ہیں اور پھر ان کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ فطرت کی گردش کے قانون اٹل ہیں۔ یہ کبھی نہیں بدلتے، چاہے وہ اپنے آپ کو کتنی ہی بار کیوں نہ ابھرائیں

اس کے برعکس مورخ صرف واقعات کو جمع ہی نہیں کرتا، بلکہ ان کی وجوہات و اثرات کو بھی بیان کرتا ہے۔ ان کے مقاصد اور نصب العین کو بھی دیکھتا ہے، اس لیے وہ فطرت سے جدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً کتابوں میں واقعات پر واقعات جمع کرائے جاتے ہیں لیکن تاریخ اسوقت تک تاریخ نہیں۔ جب تک اس میں عمل کا سلسلہ نہ ہو، اس لیے سوائے انسانی تاریخ کے اور کوئی تاریخ نہیں۔ اور یہ انسانی تاریخ کبھی اپنے آپ کو دہراتی نہیں۔ کیونکہ حرکت سرکل (CIRCLE) میں نہیں بلکہ مخروطی شکل (SPIRAL) ہوتی ہے ایسا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ واقعات اپنے آپ کو دہرا رہے ہیں، لیکن ان کے نتائج اور اثرات ہی مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً جنگ ہوتی رہتی ہے لیکن ہر جنگ دوسری جنگ سے بدلی ہوئی ہوتی ہے اسی طرح اس کے نتائج اور اثرات بھی مختلف ہوتے ہیں۔

ہیگل کے نزدیک تمام تاریخ انسانی فکر کی تاریخ ہے کوئی مورخ فکر کے بغیر تاریخ میں ہونیوالے واقعات کی روح تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ مثلاً اگر پہلی صدی میں رومی شہنشاہوں اور سینیٹ کے جھگڑوں کو تاریخ میں بیان کیا جائے تو مورخ سب سے پہلے یہ دیکھے گا کہ ان دو مخالف جماعتوں نے کیا سیاسی صورت حال پیدا کی پھر ان کے جھگڑوں نے معاملات کو آگے بڑھایا، وہ اسی سیاسی پس منظر کو دیکھے گا، جو ان دو جماعتوں کے متعلق ہوگا، اس نے ایک مورخ کا کام "لوگوں نے کیا کیا سے زیادہ جاننا ہے کہ انہوں نے کیا سوچا؟"

تاریخ کے عمل کی اصل حقیقت فہم و ادراک ہے۔ کیونکہ تاریخ میں جو کچھ ہوتا ہے وہ انسان کی مرضی سے ہوتا ہے اس لیے تاریخی عمل، انسان کی حرکت پر مبنی ہے۔ اور انسان کی مرضی اس کے سوا اور کچھ نہیں جو اسکی حرکت اور عمل سے ہوتی ہے انسان میں جذبات اور عقل دونوں موجود رہتے ہیں اور کوئی بھی شخص صرف خالص جذبات یا عقل سے کام نہیں کر سکتا ہے اسکے جذبات عقل سے، اور عقل جذبات سے ملی ہوتی ہے اس لئے بغیر جذبہ کے کوئی عمل نہیں ہو سکتا۔ ایک منصف مجرم کو فیصلہ دیتے ہوئے یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ جذبات سے مبرا ہے لیکن انصاف اور دانشمندی کے جذبات اس میں موجود ہوتے ہیں۔ تاریخ میں ہمیشہ عقل جذبات پر حکومت کرتی ہے وہ انہیں جس طرف چاہتی ہے موڑ دیتی ہے اور اپنی کامیابی کے لیے استعمال کرتی ہے۔

ہیگل تاریخ میں شخصیتوں کے عمل کو ایک نئے انداز سے دیکھتا ہے افراد یا شخصیتیں اگرچہ اپنی ذاتی خواہشات کے تحت عمل کرتی ہیں لیکن ماحول اور حالات انہیں غیر شعوری طور پر وہ کام کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ جو تہذیب و تمدن اور تاریخ انسانی میں اہمیت کے حامل ہوتے ہیں سیزر نے دستور، قانون اور مخالفوں کو ختم کر کے آمریت و شہنشاہیت قائم کی۔ اسکے بعد اس نے اپنی عظمت و شوکت اور بڑائی کی خاطر

رومی شہنشاہیت کو فتوحات کے ذریعے وسعت دی یہ اسکی ذاتی خواہش تھی' لیکن ایک غیر شعوری عمل جو سازگار ماحول میں پورا ہوا ۔ وہ رومی شہنشاہیت کا استحکام اور عظمت تھی ۔ یہی صورت حال تمام شخصیتوں کے ساتھ رہی ان کی ذاتی خواہش ان عظیم مقاصد سے مل گئیں جو آفاقی روح (WORLD SPIRIT) کی مرضی تھی اور ان شخصیتوں نے ساتھ رہی ان مقاصد کی تکمیل کی ۔ جبکہ درحقیقت ان کے سامنے اپنے مقاصد تھے ۔ اگر تاریخ میں ایسی شخصیتوں کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ خوشی و مسرت سے دور آرام و پرسکون زندگی سے محروم محنت و مشقت تندہی و سرگرمی کی زندگی گذارنے پر مجبور رہے انہوں نے سختی سے اپنے مقصد کی تکمیل کی ۔ اور جب انہوں نے یہ مقصد حاصل کرلیا وہ ایک خالی اور سوکھے چھلکے کیطرح جس کا گودہ ختم ہو گیا ہو ' گر کر ختم ہو گئے ۔ جیسے سکندر جو عین جوانی میں مر گیا یا ایسے لوگ قتل ہوئے جیسے سیزر ' یا جلاوطن ہوئے ۔ جیسے نیپولین ' ان شخصیتوں کی زندگی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تاریخی شخصیتیں منتظم تھیں ' کیونکہ انہوں نے کچھ حاصل کرنے ' اور پانے کی خواہش کی ' اور پھر اسے تکمیل تک پہونچایا ۔

انسان کن مقاصد کی تکمیل کرتا ہے ۔ مذہبی نقطہ نظر سے انسان خدا کے منصوبوں کو پورا کرتا ہے اور کانٹ کے نظریہ کے تحت انسانی فطرت کے مقاصد کو ' غیر شعوری طور پر اسکا آلہ کار بنکر ' پورا کرتا ہے ۔ ہیگل ان دونوں نظریوں سے اختلاف کرتے ہوئے ' انسان کے مقاصد کو فہم و ادراک کی تکمیل قرار دیتا ہے ' فہم و ادراک انسان کی منزل متعین کرتے ہیں جسے انسان عقل اور جذبات کی مدد سے پانے کی کوشش کرتا ہے ۔ اس میں عقل اور جذبات جو غیر عقلی ہیں ۔ آپس میں مل جاتے ہیں انسانی زندگی میں منطقی و غیر منطقی عناصر کا ملنا تحریک کا باعث ہوتا ہے ' جسکی وجہ سے انسان خاموش اور جامد نہیں رہتا ۔ بلکہ برابر عمل اور حرکت کی حالت میں رہتا ہے ۔ اور اسی لئے انسانی ذہن ان تبدیلیوں سے تجربات حاصل کرتا رہتا ہے ۔

ہیگل تمام تاریخ کو فکری تاریخ کہتا ہے ' جو عقل کے ارتقاء کو ظاہر کرتی ہے ۔ لہذا تاریخی عمل دراصل منطقی عمل ہے ۔ تاریخ میں جو تبدیلی اور ترقی ہوتی ہے وہ اچانک نہیں ہوتی بلکہ حالات کے تحت اسے ہونا پڑتا ہے ۔ اس لئے ہماری معلومات تاریخی عمل کے بارے میں صرف تجرباتی نہیں ' بلکہ پہلے سے طے شدہ ہیں ' جسکی وجہ سے ہم تاریخی تبدیلی کی ضرورت کو سمجھ سکتے ہیں ۔

تاریخ انسان کے عمل ' طریق ' اور افعال کا نام ہے ' یہ داخلی اور خارجی پہلو رکھتی ہے ' خارجی پہلو میں وہ واقعات ہیں جو زمان و مکان میں ہوتے ہیں اسکے علاوہ کچھ نہیں ' داخلی طور پر وہ افکار ہیں جو ایک دوسرے سے منطقی طور پر ملے ہوتے ہیں ۔

ہیگل نے اپنے مشہور نظریہ ' جدلیاتی عمل ' کو تاریخی عمل پر منطبق کیا ہے ' جس میں ایک نظام اپنا مخالف نظام پیدا کرتا ہے پھر ان کے ملاپ سے تیسرا نظام پیدا ہوتا ہے ' مثلاً یونان نے اپنا مخالف روم پیدا کیا ' اور اس دعوی کے خلاف دعوی نے امتزاج کے بعد عیسائیت کے غلبہ کو پیدا کیا ' لہذا یہ جدلیاتی عمل ' دعوی ' ضد دعوی ' اور امتزاج تاریخ کے پہلو میں ملتا ہے ۔ اور تاریخی تبدیلی و ترقی اسی جذبے کے تحت ہے ۔

ہیگل کے نزدیک تاریخ زمانہ حال پر ختم ہوتی ہے ۔ کیونکہ مورخ مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا وہ واقعات کا تعین شہادتوں کی بنیاد پر کرتا ہے اس لیے مستقبل کا تعین کرتے وقت کسی کتاب یا شہادت کا حاصل کرنا ناممکن ہوتا ہے اس لیے مورخ کے لیے مستقبل ایک بند کتاب اور پوشیدہ افق ہے جس کے واقعات کا تعین اس کی طاقت سے باہر ہے اس لیے تاریخ زمانہ حال پر ختم ہو جاتی ہے کیونکہ اسی وقت تک تاریخی عمل اس کی نگاہوں میں مکمل ہوتا ہے جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو چکتا ہے اسکا یہ مطلب نہیں کہ حال میں ساری ترقی آکر ٹھٹک جاتی ہے اور مستقبل اندھیرے میں چلا جاتا ہے ۔ بلکہ اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ حال ایک قطعی چیز ہے ۔

اور مستقبل ایک غیر مرئی شے، جس میں معلومات اور واقعات نہیں ہوتے۔ بلکہ امید خوف اور ڈر کے جذبات ہوتے ہیں اور امید و بیم کے جذبات کبھی تاریخ نہیں ہوتے۔

اردو کی پہلی تصنیف

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ

یہ مثنوی جو نظام دکنی نے تقریباً پونے چھ سو برس پہلے نظم کی تھی۔ اس کا صرف ایک نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے کتب خانہ خاص میں موجود تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے بڑی محنت و کاوش سے مرتب کی ہے۔ اس کے شروع میں پچاس صفحات کا سیر حاصل مقدمہ ہے جس میں فاضل مرتب نے مثنوی کی زبان کے تمام پہلوؤں کو اس انداز سے اجاگر کیا ہے کہ تحقیق کرنے والوں کو اردو کی ارتقائی منازل متعین کرنے میں صحیح مدد مل سکتی ہے۔

مثنوی اگرچہ خطِ نستعلیق میں طبع ہوئی ہے لیکن متن کا عکس اس کے مقابل دے دیا گیا ہے جس سے مخطوطے پڑھنے والے کی محنت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کاغذ عمدہ، سفید چکنا اور جلد خوبصورت ہے اردوئے قدیم کا یہ شاہکار ملک کی ہر لائبریری میں رکھنے کے قابل ہے۔ قیمت مجلد پچیس ۲۵ روپے، خاص ایڈیشن پچاس ۵۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی ۱

رفتارِ ادب

کتاب کا نام : سخنورانِ کٹڑہ
تالیف : محمد واصل عثمانی
سائز : ۲۰×۳۰ صفحات ۵۱۲
کاغذ سفید۔ کتابت وطباعت لیتھو۔ گتے کی جلد، ۱۶
قیمت : پچیس ۲۵ روپے
ناشر : مکتبہ ذی النورین۔ ۱۸۱۷، جوہر آباد کراچی نمبر ۳۸
(اشاعت ۱۹۷۸ء)

عہدِ وسطیٰ میں چھوٹے چھوٹے قصبات علوم وفنون کے مرکز رہے تھے۔ ضلع الہ آباد کا قصبہ کڑا بھی ان ہی قصبات میں سے ہے۔ یہ قصبہ مسلم تہذیب وثقافت کا مرکز اور علوم وفنون کا منبع رہا ہے۔ یہاں کے بہت سے قدیم خاندان ان روایات کے حامل تھے۔ شاہ کمال (صاحب تذکرہ) مطہر (صاحب قصائد) معین الدین مشہدی۔ وحید اور بے نظیر وارثی وغیرہ شعر وادب کی دنیا میں مشہور ومعروف ہیں۔

قاضی اطہر مبارکپوری، سید ابو محمد ثاقب کانپوری اور ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کے بزرگوں کا بھی اس سرزمین سے وطنی تعلق رہا ہے۔

محمد واصل عثمانی، تصنیف وتالیف کا ذوق رکھتے ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے قصبہ کڑا کے ارباب شعر وادب کا ایک ضخیم تذکرہ "سخنورانِ قصبہ کڑا" کے نام سے مرتب کیا ہے جس میں (۱۱۱) شعراء کے حالات اور نمونہ کلام درج ہے۔ عثمانی صاحب کی یہ علمی وادبی کوشش قابلِ تحسین ہے انھوں نے اس کتاب کی تالیف میں محنت، عرق ریزی اور سلیقہ کا ثبوت دیا ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شاعر کے حالات کے ضمن میں اس دور کی تصویر کھینچ دی ہے۔ شعراء کے علاوہ بہت سی علمی وادبی شخصیات کا حال بھی مل جاتا ہے اور کڑا کے اہل علم کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ مؤلف نے مقدمہ میں کڑا کے تاریخی حالات اور آخر میں کتابیات شامل کرکے اس کو وقیع بنا دیا ہے۔

(محمد ایوب قادری)

کتاب کا نام : مکتوبات معصومیہ دفتر دوم

اردو ترجمہ — از حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ صاحب مدظلہٗ

سائز ۲۳ × ۳۶ / ۱۶ ، ضخامت ۲۲۸ صفحات

قیمت ۱۸ روپے۔

ناشر: ادارۂ مجددیہ ۵/۲ ایچ - ناظم آباد ۲۷ کراچی۔

مکتوبات معصومیہ دفتر اول (اردو ترجمہ) پر تبصرہ اِن ہی صفحات میں کافی عرصہ پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ دفتر دوم کا اردو ترجمہ بھی اُن ہی تمام خوبیوں کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ یہ مکتوبات بھی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی قدس سرہٗ کے صاحبزادے اور جانشین حضرت عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم فاروقی قدس سرہٗ کے قلم فیض رقم کی تراوش بن کر منصۂ شہود پر آئے تھے۔ اور ان کے صاحبزادے خواجہ سیف الدین قدس سرہٗ کے ایما سے حضرت مولانا شرف الدین حسین بن عماد الدین محمد الحسینی الہروی قدس سرہٗ نے جمع و تدوین کا کام انجام دے کر اس گرانبہا مجموعہ کو اس کے تاریخی نام "وسیلۃ السعادت" سے ۱۰۷۳ھ میں شائع کیا تھا۔ دفتر دوم میں کل ۱۵۸ مکتوبات ہیں۔ اور مکتوب الیہم کی تعداد ۷۵ ہے۔ کچھ مکتوبات کئی کئی آدمیوں کے نام ہیں اور کچھ مکتوب الیہم ایسے ہیں جن کے نام کئی کئی مکتوبات ہیں۔ مثلاً پہلے مکتوبات کے تین مکتوب الیہم ہیں: مولانا محمد صدیق، مولانا حسن علی اور محمد امین بدخشی۔ اس کے برعکس مولانا محمد صدیق کے نام ۲ مکتوبات ہیں، پہلا اور تیسرا۔ حسن علی کے نام دو مکتوب ہیں پہلا اور دوسرا اور محمد امین کے نام ۳ مکتوبات ہیں، پہلا، اٹھائیسواں اور ایک سو ستائیسواں۔

عموماً جملہ مکتوبات نہایت دقیق مسائل سے متعلق ہیں۔ مکتوب الیہم کے لئے تو یہ سب ہی یقیناً رشد و ہدایت کی کان ہوں گے۔ مگر فی زمانہ اکثر حضرات کی فہم و ادراک سے ماوراء ہیں۔ تاہم جس طرح حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کے مکتوبات آج بھی اہل دل اور سالک راہ حضرات کے لئے علوم و معارف کا خزانہ ہیں۔ اسی طرح خواجہ محمد معصومؒ کے یہ مکتوبات بھی ان حضرات کے لئے جو مسائل تصوف کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اور ان کے کنہ و حقیقت کو جاننے کے خواہشمند ہیں۔ رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہیں۔ مثلاً پہلے مکتوب میں حقیقت محمدی اور حقیقت کعبہ ربانی کا مقابلہ کر کے ایک کی دوسری پر فضیلت ظاہر کی گئی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو لوگ اِن دونوں حقیقتوں کے مفہوم سے ناواقف ہیں وہ افضل و مفضول کے اس باریک فرق کو کیا سمجھیں گے تاہم اب بھی نفوس چند ایسے موجود ہیں جو اِن دقیق مسائل سے آگاہ ہیں اور یہ مکتوبات ان کو مزید آگاہی بخشتے ہیں۔ ترجمہ کرنے میں حضرت شاہ صاحب کو یدطولیٰ حاصل ہے۔ چنانچہ یہ مکتوبات جن کو سمجھنا بھی دوسروں کے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہیں۔ ایسی عام فہم اور سلجھی ہوئی اردو عبارت میں منتقل کئے گئے ہیں۔ کہ اُس کے ظاہری مفہوم کو سمجھنے میں قطعاً الجھن محسوس نہیں ہوتی۔ لائق مترجم نے سورتوں، آیتوں اور حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات کے جن کے حوالے آئے ہیں نمبر حاشیہ میں دے کر بصیرت و عرفان کا مزید سامان فراہم کر دیا ہے۔ غرض تصوف کے لٹریچر میں یہ نہایت گرانقدر اضافہ ہے۔

شاراحمد صدیقی

بادۂ عرفان

از پروفیسر نعیم تقوی۔ ناشر: انجمن غمخواران عباس رضویہ سوسائٹی۔ سائز: $\frac{23 \times 36}{16}$ ضخامت ۴۸ صفحات۔

یہ کتاب پروفیسر نعیم تقوی صاحب کے تازہ کلام کا مجموعہ ہے۔ اس میں چند نعتیں ہیں اور کچھ قصیدے، منقبتیں، نوحے اور سلام ہیں۔ ان سب نظموں کا رنگ و آہنگ بہت عمدہ ہے۔ بعض التزامات برت کر شاعر نے اپنے کمال فن اور قادر الکلامی کا بھی ثبوت بہم پہنچایا ہے، مثلاً پہلی نعت صنعت مہملہ یا غیر منقوطہ میں ہے۔ اور ایک قصیدے کے تمام اشعار میں ایک ہی قافیہ استعمال کیا گیا ہے۔ تمام نظموں میں شاعر کے دلی جذبات اور عقیدت کی فراوانی نے شعری محاسن اور مترنم بحروں کے ساتھ مل کر اثر و تاثر میں معتدبہ اضافہ کر دیا ہے۔ مجموعی طور پر شاعر کی یہ ایک کامیاب کوشش ہے جس کے لئے وہ قابل مبارک باد ہیں۔

(ثناء الحق صدیقی)

اوراق سالنامہ

مدیران: وزیر آغا ۔ سجاد نقوی

جنوری و فروری ۱۹۸۰ء لاہور

مقام اشاعت: لاہور

ایک معیاری ادبی رسالہ ہے۔ جس کی ترتیب میں بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیا گیا ہے۔ مضامین معیاری ہیں اور مضمون نگاروں نے انفرادی طور پر اپنے مضمون کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ ہر مذاق کے قاری کی دلچسپی کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ معیاری ادبی رسالوں کا فقدان تو نہیں ہے لیکن کمی ضرور ہے۔ اچھے رسالوں میں یہ رسالہ اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ اور اس میں مدیران جریدہ کی بصیرت کو پورا پورا دخل ہے۔ جناب وزیر آغا صاحب اور سجاد نقوی صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ اپنی مساعی میں کماحقہٗ کامیاب ہوئے ہیں۔ اچھے ادیبوں اور اچھے مضامین کا انتخاب کیا گیا جس کی وجہ سے رسالہ معیاری ہے۔

علی گڑھ تحریک کے دو ستون

مصنف: الحاج محمد زبیر۔ ناشر: خالد اے ۵/۴۷، بلاک ایچ نارتھ ناظم آباد۔ کراچی

مطبع: ایجوکیشنل پریس پاکستان چوک کراچی۔ قیمت: تین روپیہ۔

الحاج محمد زبیر صاحب کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ نے علم و ادب کی دنیا میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ گراں قدر ہیں۔ زیر نظر کتاب میں موصوف نے علی گڑھ تحریک کی دو مقتدر شخصیتوں یعنی سر سید احمد خاں اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی خدمات کو مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ کسی موضوع کا انتخاب، اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کرنا اور پھر انداز بیان یہ تینوں چیزیں زبیر صاحب کے ادبی شہ پاروں میں ملتی ہیں۔ اور اس کتاب میں یہ خوبیاں بڑی نمایاں انداز میں جھلک رہی ہیں۔ علی گڑھ تحریک اور یہ دونوں شخصیتیں لازم ملزوم ہیں۔

توقیر صدیقی

انجمن کی مطبوعات ملنے کا پتہ

علمی، تاریخی، ادبی اور اسلامی کتب کا مرکز

پین اسلامک بک سنٹر

۴۷۔ نیو اردو بازار۔ کراچی

نئے خزانے

ابوسلمان شاہجہاں پوری

یہ اشاریہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔

ادارے
ادب
اردو زبان اور اس کے مسائل
تاریخ و سیاسیات
تعلیمات
تنقید
خطوط
خود نوشت
سیر و سیاحت
شخصیات :
علامہ اقبال
مولانا محمد علی
ادبی شخصیات
اطباء
دینی و مذہبی شخصیات
صحابہ کرام رض
طب
کتاب میلہ
کتابیات
لسانیات
مذہبیات :
سیرت نبوی صلعم
قرانیات
قانون و شریعت
مسائل و مباحث دینی و اخلاقی
معاشیات

اس اشاریے کی ترتیب میں ماہ جون ۱۹۷۹ء اور دیگر
مہینوں کے مندرجہ ذیل رسائل سے مدد لی گئی ہے۔

ماہنامہ	اجالا	کراچی	مارچ ۱۹۷۹ء
〃	احساسات	لاہور	مئی، جون 〃
〃	الانسان	کراچی	جون 〃
〃	آئینہ قسمت	لاہور	اپریل مئی 〃
〃	برہان	دہلی	جون 〃
〃	پیام عمل	لاہور	〃 〃
〃	تحقیق	〃	نمبر ۳، ۴ 〃
〃	تذکرہ	〃	اپریل 〃
〃	ترجمان الحدیث	〃	جون 〃
〃	ترجمان القرآن	〃	〃 〃
〃	جام نو	کراچی	جلد ۲۸ نمبر ۱ 〃
〃	الحق	اکوڑہ خٹک	مئی 〃
〃	الرشید	لاہور	جون 〃
دوماہی	صحیفہ	〃	مئی جون 〃
ماہنامہ	صدائے اسلام	پشاور	جون 〃
سہ ماہی	العلم	کراچی	جنوری 〃
ماہنامہ	فاران	〃	جون 〃
〃	فیض الاسلام	راولپنڈی	مئی جون 〃
〃	قومی زبان	کراچی	جون 〃
〃	قومی صحت	لاہور	مئی جون 〃

ماہنامہ	کتاب	لاہور	جون ۱۹۷۹ء
〃	محدث	〃	جمادی الاول والثانی ۱۳۹۹ھ
〃	میثاق	〃	جون ۱۹۷۹ء
〃	نئی قدریں	حیدرآباد	نمبر ۶۰ 〃
〃	نیرنگ خیال	راولپنڈی	نمبر ۶۱۸ 〃
پندرہ روزہ	صحیفہ اہل حدیث	کراچی	۱۲ جون 〃
ہفت روزہ	الاحرار	لاہور	فروری تا اپریل 〃
〃	الاسلام	〃	جون 〃
〃	الاعتصام	〃	〃 〃
〃	البلاغ	بہاولپور	〃 〃
〃	انصاف	راولپنڈی	〃 〃
〃	تیمر حیات	لکھنؤ	۱۰ جون 〃
〃	چٹان	لاہور	جون 〃
〃	خدام الدین	〃	〃 〃
〃	فکر و عمل	حیدرآباد	۲ 〃
〃	کشمیر	مظفرآباد	جون 〃
〃	لاہور	لاہور	〃 〃
〃	المنبر	فیصل آباد	〃 〃
〃	ہماری زبان	دہلی	〃 〃

ادارے

اشفاق احمد (مرحوم)	آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس کے پانچ سال	کتاب	لاہور	جون	۱۹۷۹ء	ص ۲۷
ثناء اللہ عبدالرحیم بلتستانی	جامعہ امام محمد بن سعود کا تعارف	ایشیا	″	۲۷ مئی	″	ص ۱۲
″	″ ″ ″ ″	الاعتصام	″	یکم جون	″	ص ۷
″	″ ″ ″ ″ (۲)	″	″	۱۵ ″	″	ص ۱۲
″	″ ″ ″ ″ (۳)	″	″	۲۲ ″	″	ص ۱۲
زید الخیر	ازمنیشل ایسوسی ایشن آف سکول لائبریرین شپ	کتاب	″	″	″	ص ۲۸
معین الدین لکھوی، مولانا	خطبہ صدارت (اہل حدیث کانفرنس لاہور)	الاعتصام	″	۲۲ ″	″	ص ۷
دانش کدوں میں اردو تحقیق	(کشمیر یونی ورسٹی میں اردو تحقیقاتی مقالات کی فہرست)	ہماری زبان	دہلی	یکم ″	″	ص ۴
″	(لکھنؤ یونی ورسٹی میں ″ ″ ″)	″	″	۱۵ ″	″	ص ۴
″	(جموں ″ ″ ″ ″)	″	″	۲۲ ″	″	ص ۴
″	(میرٹھ ″ ″ ″ ″)	″	″	″	″	ص ۴

ادب

اظہر قادری، پروفیسر	شخصیت سے ذات تک	جام نو	کراچی	جلد ۲۸ نمبر ۱		ص ۲۵
انور سدید	پاکستان میں اردو افسانے کے بتیس سال	″	″	″		ص ۳۷
پریشان خٹک، پروفیسر	پاکستان کا عصری ادب۔ پشتو ادب۔ ایک جائزہ	قومی زبان	″	جون	″	ص ۱۱
حسرت کاس گنجوی، ڈاکٹر	اردو ادب اور حب الوطنی	جام نو	″	جلد ۲۸ نمبر ۱		ص ۷۶
سرفراز اختر، مس	غزل کا فن	ہماری زبان		۱۵ جون	″ ″	ص ۲
عبدالقادر	امریکی ناول رگ ورڈ کے پلاٹ پر ایک نظر	لاہور	لاہور	۲۷ مئی	″ ″	ص ۵

اُردو زبان اور اس کے مسائل

حمود الرحمٰن، چیف جسٹس (ریٹائرڈ)	خطبہ صدارت (اردو کانفرنس لاہور)	قومی زبان	کراچی	جون	۱۹۷۹ء	ص ۶
وزیر آغا، ڈاکٹر	مقالہ اردو کانفرنس۔ لاہور	”	”	”	”	ص ۱۰-۱۲

تاریخ و سیاسیات

اکرام ادیب	تصور پاکستان کس نے پیش کیا؟	الانسان	”	”	”	ص ۸
بزاز، پنڈت پریم ناتھ	کشمیر سے غداری (۲۶)	کشمیر	راولپنڈی	۲۲ مئی	”	ص ۳
” ” ”	” (۲۸)	”	”	۵ جون	”	ص ۳
” ” ”	” ” (۲۹)	”	”	۱۲ ”	”	ص ۳
” ” ”	” ” (۳۰)	”	”	۱۹ ”	”	ص ۳
حسین اورنگ زیب	جنرل اعظم خان ــ تاریخ بولتی ہے۔	احساسات	لاہور	مئی ”	”	ص ۱۶
دبیر حسین رضوی، سید	برصغیر کی دہشت پسند تحریک میں طالبات کا کردار	تذکرہ	”	اپریل	”	ص ۲۷
رضا کاظم	بزنجو سے ملاقات	”	”	”	”	ص ۱۵
ریاض صدیقی	سرسید، علی گڑھ اور دیوبند	قومی زبان	کراچی	جون	”	ص ۲۹
شمس الہدیٰ بھاگل پوری	ایران کا انقلاب	تعمیر حیات	لکھنؤ	۱۰ ”	”	ص ۱۰
صلاح الدین حیدر	انگلستان پر ایک نظر	تذکرہ	لاہور	اپریل	”	ص ۲۷
محمد ادریس کاندھلوی	الاحکام القرآنیہ فی تحریم موالاۃ برطانیہ[1]	الاحرار	”	۱۹ ”	”	ص ۱۱
نور الصباح بیگم	سیال کوٹ اور چونڈہ	جام نو	کراچی	جلد ۲۸ نمبر ۱		ص ۵۹
	سردار شیر باز مزاری سے انٹرویو	چٹان	لاہور	۴ جون	”	ص ۱۰

تعلیمات

ثناء الحق صدیقی	اسلامی نظام تعلیم۔ مکہ تعلیمی کانفرنس کی تجاویز کی روشنی میں	العلم	کراچی	جنوری	”	ص ۳

---

[1] برطانیہ سے ترکِ موالات پر ایک اہم رسالہ جو نادر و نایاب ہونے کی وجہ سے چھاپ دیا گیا۔

عبداللہ، ڈاکٹر حمید	عہد اسلام کے چند تعلیمی اصول	چٹان	لاہور	۴ جون ۱۹۷۹ء	ص ۲۷
" "	پاکستان میں اسلامی تعلیمی انقلاب کے تقاضے	"	"	" "	" " ص ۲۷

تنقید

انجم، قاضی عارف حسین	تاریخ روہیلہ (رستم بجنوری)	قومی زبان	کراچی	جون " "	ص ۳۲
انور عنایت اللہ	جمیل زبیری کے (زرد پتے)	جام نو	"	جلد ۲۸ نمبر ۱	ص ۲۲۴
ایوب خاور	سورج کی آنکھ از اعجاز فاروقی	نیرنگ خیال	راولپنڈی	شمارہ ۷/۸	ص ۴
حبیب احمد صدیقی	مضامین رشید	فاران	کراچی	جون " "	ص ۲۱
رشید امجد	پہلی اڑان ـ نیم سحر	جام نو	"	جلد ۲۸ نمبر ۱	ص ۲۲۷
شاہد حسین، محمد	اندر سبھا ـ ایک تعارف	ہماری زبان	دہلی	۲۲ جون " "	ص ۱۲
وقار راشدی	آدھا سورج آدھا سایہ از حسرت کاس گنجوی	جام نو	کراچی	جلد ۲۸ نمبر ۱	ص ۲۲۹
ہاشمی، اے، اے	اوتھیلو پر اجمالی نگاہ	ہماری زبان	دہلی	۲۲ جون " "	ص ۱

خطوط

ارشد، حافظ رشید احمد	پروفیسر شیخ عنایت اللہ اور ان کے علمی خطوط	العلم	کراچی	جنوری " "	ص ۲۶
اسد اللہ قریشی، محمد	مکتوبات حضرت علیؓ	لاہور	لاہور	۲۴ جون " "	ص ۸
امجد سیالکوٹی، ابو ادریس	حضرت مجدد الف ثانی کا ایک مکتوب	"	"	۲۴ " "	ص ۱۰
صدیق الحسن نعمانی	حضرت ابوبکرؓ کے مکاتیب گرامی	"	"	۱۷ " "	ص ۵
عبد الرزاق، حافظ	بچھڑے ہوئے ایک رفیق (ماہر القادری) کا خط	فاران	کراچی	" "	ص ۴۰
عشرت رحمانی	مشاہیر کے خطوط [1]	قومی زبان	"	" "	ص ۲۵
نثار الدین احمد، ڈاکٹر	مولانا گیلانی کے سات غیر مطبوعہ خطوط	صحیفہ	لاہور	مئی "	ص ۱۴

---

[1] خواجہ حسن نظامی، مولوی عبد الحق، نیاز فتح پوری، تاجور نجیب آبادی، سلطان حیدر جوش کے خطوط

خودنوشت

عبداللہ خان پوری، مولانا قاضی محمد	خودنوشت حالات زندگی (آخری قسط)	الاعتصام	لاہور	یکم جون ۱۹۷۹ء	ص ۷
غازی کابلی	کچھ جگ بیتی کچھ آپ بیتی	الاحرار	〃	۱۶، فروری 〃	〃 ص ۸
مبشر حسن، ڈاکٹر	رزم زندگی	احساسات	〃	مئی جون 〃	〃 ص ۵۳
ہاشم رضا، سید	عمر رفتہ	جام نو	کراچی	جلد ۲۸ نمبر ۱	ص ۲۹

سیر و سیاحت

اشرف علی قریشی، محمد	سفرنامہ حجاز	صدائے اسلام	پشاور	جون 〃	〃 ص ۳۲
حرار ضا	افتخار حسین صاحب کا سری لنکا کا دورہ	اجالا	کراچی	مارچ 〃	〃 ص ۵

شخصیات

علامہ اقبال

ابوالکلام خواجہ	آغا شورش کاشمیری اور علامہ اقبال	چٹان	لاہور	۱۸ جون 〃	ص ۲۲
ریحان الحسن فاروقی	اقبال کا نظریہ قومیت اور پاکستانی دستور	جام نو	کراچی	جلد ۲۸ نمبر ۱	ص ۹۵
ضیا، محمد اسلم	اقبال کے اردو کلام کا عروضی تجزیہ	صحیفہ	لاہور	مئی جون 〃	ص ۲۴
ظہیر فتح پوری، ڈاکٹر	اقبال کی اردو غزل	〃	〃	〃 〃	ص ۱
عبدالحمید، ڈاکٹر	سرسید، اکبر اور اقبال	〃	〃	〃 〃	ص ۶
فتح محمد ملک	رینا میری شمل اور پاکستانی ادب	〃	〃	〃 〃	ص ۳۵
محمود علی خان	اقبال اور مفکر مشرق	فیض الاسلام	راولپنڈی	〃 〃	ص ۲۹

مولانا محمد علی

ابو مسلم صدیقی	محمد علی جوہر سے محمد علی جناح تک	العلم	کراچی	جنوری 〃	ص ۱۷
احسان اللہ شریف	مولانا محمد علی جوہر کی وفات کے صد سال	〃	〃	〃 〃	ص ۲۲
جلیل قدوائی	دو بھائی اور ایک ماں	〃	〃	〃 〃	ص ۱۲

حسن عطا شاہ	مولانا محمد علی جوہر	العلم	کراچی	جنوری	۱۹۷۹ء، ص ۹
رئیس منظر	وہ کہیں اور سنا کرے کوئی	ہماری زبان	دہلی	یکم جون	" " ص ۱

ادبی شخصیات

ابوسلمان شاہجہان پوری	مولانا حسرت موہانی ایک مختلف الجہات شخصیت	چٹان	لاہور	۴م "	" " ص ۳۷
اخلاص حسین زبیری	ملا واحدی مرحوم کی زندگی اور شخصیت	العلم	کراچی	جنوری	" " ص ۷۳
آفتاب احمد نقوی	علی اکبر عباس۔ قدآور لہجے کا شاعر	نئی قدریں	حیدرآباد	شمارہ نمبر ۵،۶	" " ص ۳۷
تسنیم، عبدالوہاب	شاعرِ اعظم اور ذکا	ہماری زبان	دہلی	یکم جون	" " ص ۳
جاوید خالد آرائیں	شاہ حسین کی کافیاں	نئی قدریں	حیدرآباد	شمارہ نمبر ۵،۶	" " ص ۴۰
جمال آر نظامی	حالی اور غزل	ہماری زبان	دہلی	۱۵ جون	" " ص ۱
حسن مرتضیٰ	استاد مرتضیٰ مظہری	پیام عمل	لاہور	"	" " ص ۱۸
ذہین عالم خاں سروہا	ریختہ کا شاعر۔ رسا	قومی زبان	کراچی	"	" " ص ۲۰
رشید امجد	احمد ندیم قاسمی	نئی قدریں	حیدرآباد	شمارہ نمبر ۵،۶	" " ص ۲۱
رفیع عالم، پروفیسر	مولوی عبدالحق۔ ایک زندہ تحریک	جام نو	کراچی	جلد ۲۸ نمبر ۱	ص ۷۹
شفیق، شفیق احمد	رشید الزماں خلش	"	"	"	ص ۹۸
شمس بریلوی	غالب کی فارسی غزل گوئی	"	-	"	ص ۷۴
شمیم حیات سیال	شاعر بلبل۔ سید جعفر طاہر	نیرنگ خیال	راولپنڈی	شمارہ ۶۱۸	ص ۸
شور، منظور حسین	دادای شعاعِ نو کے آئینے میں	نئی قدریں	حیدرآباد	شمارہ نمبر ۵،۶	" " ص ۲۵
صابر آفاقی، ڈاکٹر	آزر عسکری	"	"	"	" " ص ۱۵
صدیق الحسن نعمانی	گوئٹے۔ جرمنی کا مشہور فلسفی شاعر	لاہور	لاہور	۲۷ مئی	" " ص ۷
صدیقہ ارمان، ڈاکٹر	نظیر اکبرآبادی	قومی زبان	کراچی	جون	" " ص ۳۹
عبداللہ، ڈاکٹر سید	ہم چیر اغے ہم گلے (جسٹس ایس اے رحمن کی یاد میں)	"	"	"	" ص ۹
غبار، یاور	شفقت کاظمی کی غزلیں	جام نو	"	جلد ۲۸ نمبر ۱	ص ۶۵
فضل تقدیر	مصور مشرق عبدالرحمن چغتائی	کتاب	لاہور	جون	" " ص ۳۷
رضیہ زہرا	ملک الشعرا بہار اور ان کی شاعری	ہماری زبان	دہلی	یکم جون	" " ص ۲

نذیر احمد تعلاری	خواجہ غلام فرید کے ہم عصر سرائیکی شعرا	العلم	کراچی	جنوری	۱۹۷۹ء ص ۵۱
وفا راشدی	خواجہ محمد حسن جان سرہندی	"	"	"	" " ص ۵۷

اطباء

فدا، سید حسین شاہ	حکیم عبدالسلام ہزاروی	المنبر	فیصل آباد	۲۳ مئی	" " ص ۱۲
محمد اکرم خان ہیبرڈ، حکیم	حضرت شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشیؒ	قومی صحت	لاہور	مئی جون	" " ص ۵

دینی و مذہبی شخصیات

خورشید حسین بخاری، سید	حضرت شاہ سکندر محبوب الٰہیؒ	الہام	بہاولپور	۱۱ جون	" " ص ۲
شکر اللہ نعمانی، مولانا	نواب صدیق حسن قنوجی	المنبر	فیصل آباد	۱۳ "	" " ص ۲
طیب شاہین لودھی	علامہ ابن قیم	ترجمان القرآن	لاہور	جون	" " ص ۲۷
عبدالسلام، مولانا	مولانا محمد جانؒ	خدام الدین	"	۲۹ "	" " ص ۱۵
عبداللہ، قاضی محمد	علمائے خان پور اور خاندان غزنویہ	الاسلام	"	۸ "	" " ص ۴
عبدالماجد دریابادی، مولانا	مولانا ثناء اللہ امرتسری	الاعتصام	"	۱۵ "	" " ص ۱۱
عبدالمجید چکوال، پروفیسر	حضرت مولانا محمد قاسم	خدام الدین	"	۲۲ "	" " ص ۱۳
محمد متین ہاشمی، سید	حضرت شاہ ولی اللہ کا نظریہ انقلاب اور معرکہ بالاکوٹ	"	"	۱۵ "	" " ص ۹
ندر خلیق رسوی	سید عطاء اللہ شاہ بخاری	نئی تدریس	حیدرآباد	نمبر ۵، ۶	" " ص ۴۵
نذیر رانجھا	حضرت داتا گنج بخشؒ	العلم	کراچی	جنوری	" " ص ۴۴

صحابہ کرامؓ

طالب ہاشمی	حضرت ام الفضل لبابۃ الکبریٰ		لاہور	جمادی الاول و الآخرہ ۱۳۹۹ھ	ص ۶۰
"	حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب	نادان	کراچی	جون	۱۹۷۹ء ص ۷
ظفر اللہ بیگ	حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمات	خدام الدین	لاہور	۸ "	" ص ۱۱
"	" " " (آخری قسط)	"	"	۱۵ "	" ص ۱۷
عبدالرشید عراقی، ملک	حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (۲)	الاعتصام	"	یکم "	" ص ۵
غلام علی، ملک	حضرت علیؓ کی زرہ کا سرقہ	ترجمان القرآن	"	جون	" ص ۴۱

محمد امین اثری، مولانا	مشہور واقعہ الوشمہ ابن عمرؓ پر عمل کرنے کی حقیقت	محدث	لاہور	جمادی الاولیٰ و الآخرہ ١٣٩٩ھ	ص ٥٧

طب

صادق حسین، ڈاکٹر	علم طب اور اس کے عملی و علمی پہلو	قومی صحت	"	مئی جون ١٩٧٩ء	ص ٧
"	طب اور علاج پر حضورؐ کا اعتماد	"	"	" "	ص ٣

کتاب میلہ

ابراہیم سعد	نیشنل بک کونسل کے بچوں کے کتاب میلے[1]	کتاب	"	جون " "	ص ۴
چراغ، محمد علی	بچوں کا کتاب میلہ	"	"	" " "	ص ٧

کتابیات

ابو سلمان شاہجہان پوری	نئے خزانے (دسمبر ١٩٧٨ء کے مضامین کا اشاریہ)	قومی زبان	کراچی	" "	ص ٥٢
راشد علی اسدی جے پوری	تصانیف مولانا شاغل جے پوری (٢)	العلم	"	جنوری	" ص ٦٢
عبدالرشید عراقی، ملک	تذکرۃ ابوالوفاءؒ۔ تصانیف	الاسلام	لاہور	٢٩ جون	" صفحہ ۴

لسانیات

شبیر علی کاظمی	ماہیت زبان اور اردو	جام نو	کراچی	جلد ٢٨ نمبر ١	ص ٨٧
شگفتہ نسرین	جامع القواعد	نئی قدریں	حیدرآباد	نمبر ٥، ٦	" ص ۴٢

مذہبیات

سیرت نبویؐ

عبدالحق چریان، مولانا	ختم نبوت (١)	الاحرار	لاہور	١٦ فروری	" " ص ٢١

---

[1] کتاب کے اس شمارے میں پشاور، راولپنڈی میں کتاب میلوں کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔

کوثر چوہان	رہبر کامل صلی اللہ علیہ وسلم	الاسلام	لاہور	٢٩ جون	١٩٧٩ء ص	٧
محمد یوسف قریشی، مولانا	غریبوں کا ملجا صلی اللہ علیہ وسلم	صدائے اسلام	پشاور	"	" ص	٧

قرآنیات

اسرار احمد	مطالعہ قرآن حکیم	میثاق	لاہور	مئی جون	" " ص	٣٣
حسین شاہ، پروفیسر سید	قرآن اور سائنسی نکات	فیض الاسلام	راولپنڈی	مئی	" " ص	٢٧
زوار حسین، سید	قرآن حکیم اور تزکیہ نفس	میثاق	لاہور	مئی جون	" " ص	٤٤
ظفر ندوی، محمد نفضل ندبیر	تغیر	فیض الاسلام	راولپنڈی	مئی	" " ص	١٩
" " "	"	"	"	جون	" " ص	١٩
محمد اسلم، پروفیسر	قرآن کا معاشرتی نظام	میثاق	لاہور	مئی جون	" " ص	٩٥
محمد علی، مولانا	قتل مرتد اور قرآن	لاہور	"	٢٢ "	" ص	٥
یوسف سلیم چشتی، پروفیسر	اخلاق حسنہ اور قرآن	میثاق	"	مئی جون	" ص	٤٩

قانون و شریعت

اخیار اللہ، مولانا محمد	زکوٰۃ اور عشر	خدام الدین	"	یکم جون	" ص	٣٣
امجد حسین، ملک	اسلام کا تصور عدل	المنبر	فیصل آباد	٣٠ مئی	" ص	٥
بشیر احمد قاضی	تعزیرات اسلام	ترجمان القرآن	لاہور	جون	" ص	١٧
حیدر، شیخ	نفاذ شریعت اسلامی	میثاق	"	مئی جون	" ص	٨٨
عبدالرحمٰن کیلانی، مولانا	نظام زکوٰۃ و عشر اور ٹیکس	محدث	"	جمادی اولا و الآخرہ	٩٩ھ ص	٢
عبدالرحیم پوپل زئی، مفتی	احکام تولیت وقف	صدائے اسلام	پشاور	جون	" ص	٢٥
کلیم اللہ، مولانا مفتی محمد	مسئلہ زکوٰۃ الارض (عشر) تحقیق کی روشنی میں	الاحرار	لاہور	١٦ مارچ	" ص	١٣

مسائل مباحث و دینی و اخلاقی

ادریس رضوی	اسم اعظم	آئینہ قسمت	"	اپریل مئی	" ص	٢٦
اسرار احمد، ڈاکٹر	امت مسلمہ کا عروج و زوال	میثاق	"	مئی جون	" ص	١
برہان احمد فاروقی، ڈاکٹر	عصر حاضر کے چیلنج کا نرد	"	"	"	" ص	٧٩
خلیل، محمد صادق	شعائر اللہ اور ان کی تعظیم	محدث	"	١٣٩٩ء ادالاآخری جمادی الاول	ص	٥١

ریاض الحسن نوری	شراب کے مادی اثرات و نتائج	ترجمان القرآن	لاہور	جون	۱۹۷۹ء	ص ۲۹
سعید مغل	امریکہ میں تحریکِ اسلامی - ڈاکٹر ماینس احمد سے ایک ملاقات	ایشیا	"	۲۹ اپریل	" "	ص ۱۱
محب اللہ شاہ راشدی، مولانا سید	فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا	صحیفہ اہل حدیث	کراچی	۱۲ جون	" "	ص ۲
مودودی، مولانا سید ابوالاعلی	داعی حق کی خصوصیات	ترجمان القرآن	لاہور	"	" "	ص ۹
" " " "	دعوت اسلامی کے عالم گیر اور بنیادی اصول	چٹان	"	۱۱ "	" "	ص ۴۳

معاشیات

کریم رضا زیدی	اسلامی ممالک کے معاشی حالات	الانسان	کراچی	جون	" "	ص ۲۱
محمد طاسین، مولانا	معاشی معاملات کا قرآنی تصور	میثاق	لاہور	مئی جون	" "	ص ۶۷

ماخذات

جلد اول

احوال شعرا و مشاہیر

مرتبہ : سرفراز علی رضوی

یہ تالیف کتابیاتی اور شخصیاتی معلومات و حوالہ جات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے اور دنیا کے ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ قیمت : پچیس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی

کچھ دن بچایئے تا ابد کمایئے

پہلی اسکیم: صرف ۶۶ مہینوں تک ایک مقررہ رقم ماہ بہ ماہ جمع کیجئے اور ۱۰۱ روپے ماہانہ فی سیکڑہ ابدی طور پر کمایئے ــــ نسلاً بعد نسلاً۔

دوسری اسکیم: اگر آپ ۱۰۸ مہینوں تک مقررہ رقم ماہ بہ ماہ جمع کرتے ہیں تو آپ کو ۲۱۲ روپے فی سیکڑہ ماہانہ تا ابد حاصل ہوتے رہیں گے، یعنی نسلاً بعد نسلاً۔

نیشنل بینک آف پاکستان کے یہ منصوبے آپ اور آپکے ورثاء کیلئے مستقل ماہانہ آمدنی کا ذریعہ ہیں۔

منصوبے کی اہم خصوصیات:

- یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ آپ مقررہ رقم ۶۶ مہینوں کے لئے جمع کرتے ہیں یا ۱۰۸ مہینوں کے لئے۔
- بعد از اختتام مدت آپ کچھ بھی ادا نہیں کریں گے، بلکہ اب بینک کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ آپ کو ادائیگی کرتا رہے۔
- فرض کیجئے آپ نے پہلی اسکیم پسند کی ہے تو ہر ماہ ۱۰۰ روپے جمع کرنے پر ۶۶ ماہ بعد نیشنل بینک آپ کو اور آپکے ورثاء کو ۱۰۱ روپے ماہانہ ادا کرتا رہے گا، اور اگر آپ نے دوسری اسکیم منتخب کی ہے تو صرف ۱۰۸ ماہ بعد اسی ۱۰۰ روپے ماہوار ادا کرنے کے عوض نیشنل بینک آپکو اور آپکے ورثاء کو تا ابد ۲۱۲ روپے ماہانہ ادا کرتا رہے گا۔
- آپ دس روپے سے بھی اس اسکیم میں حصہ لے سکتے ہیں۔
- پہلی ادائیگی کے چھ ماہ بعد آپ جب بھی چاہیں اسکیم سے علیحدہ ہو سکتے ہیں، اس صورت میں آپکی کل جمع شدہ رقم بمعہ منافع آپکو واپس کر دی جائے گی۔
- یہ ماہوار آمدنی آپکے ورثاء کو بھی اسی طرح ادا کی جاتی رہیگی جسطرح آپکو اور ورثاء کے ورثاء کو بھی۔
- اپنی جمع شدہ رقم پر آپکو قرضے کی سہولت بھی حاصل ہوگی۔
- آپ جب چاہیں پہلی اسکیم کو دوسری اور دوسری اسکیم کو پہلی میں تبدیل کر سکتے ہیں۔
- اگر اسکیم میں شرکت کے بعد کسی وجہ سے کچھ عرصے تک آپ کے لئے ادائیگی ممکن نہ ہو (یہ عرصہ چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیئے) تو آپ واجب الادا رقم اور اس عرصے کا منافع ادا کر کے اپنی اسکیم کو معمول کے مطابق جاری رکھ سکتے ہیں۔

تفصیلات کے لئے نیشنل بینک آف پاکستان کی کسی بھی شاخ سے رابطہ قائم کیجئے

قومی ترقی۔ قومی بینک

نیشنل بینک آف پاکستان

NBP-20-79-UD RIO(K)PID

Ravi-Delmon Ltd.

DONATE BLOOD

help
save a
human
life

PBS Pakistan Burmah Shell

Regd. S. No. 1136

Phone : 217137

Monthly **QAOMI ZABAN** Karachi

ناشر:- شبیر علی کاظمی- کلیم الحسن تقوی کے زیر اہتمام انجمن پریس کراچی میں چھپ کر
انجمن ترقی اردو (پاکستان) - بابائے اردو روڈ - کراچی سے شائع ہوا۔